«شادی کی قدیم مسلم روایات کی اسیر عورتوں
کے بارے ... ایک دلچسپ اور روایت شکن ناول»

اُداسی کی رُت

علی غالم

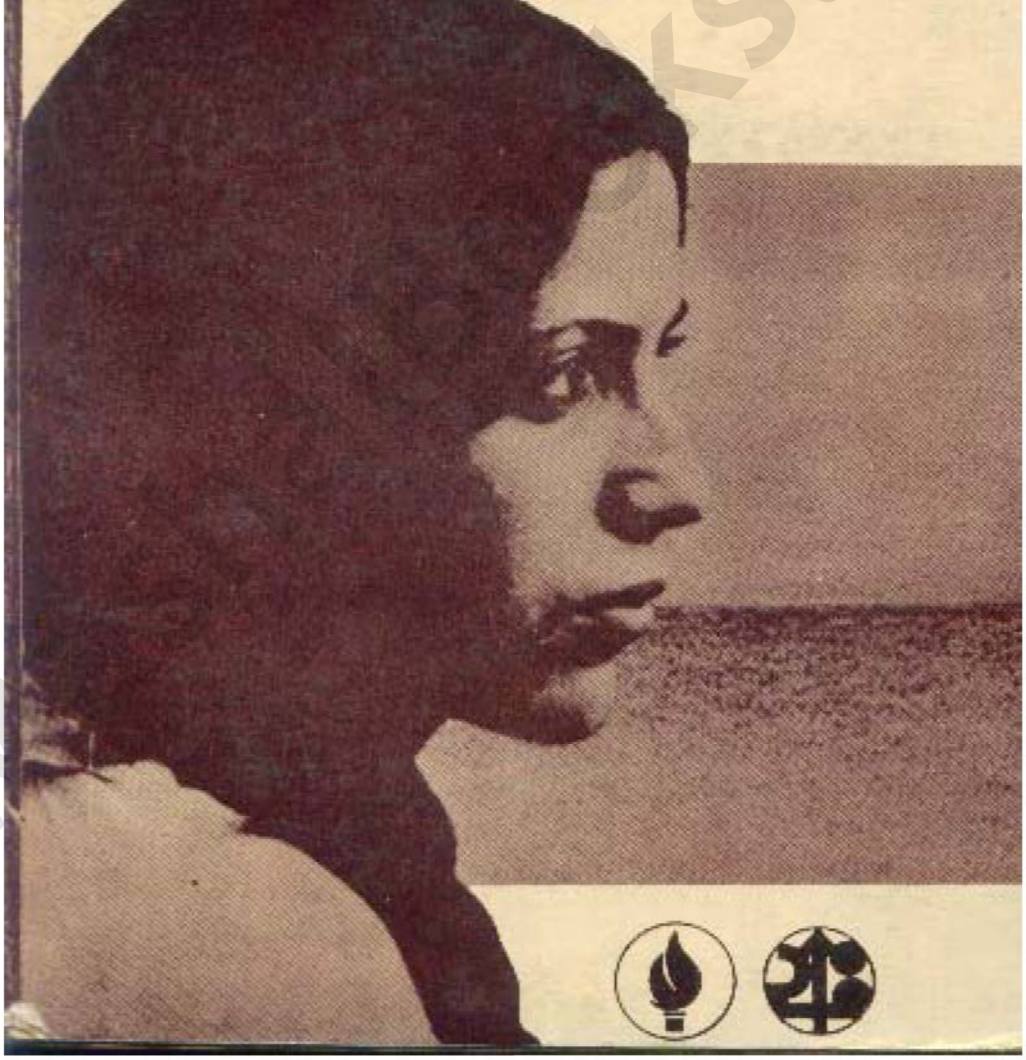

اداسی کی رُت

علی غالم

مترجم- قاضی جاوید

مشعل

آر-بی 5 ' سیکنڈ فلور' عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور54600 ' پاکستان

MashalBooks.com

MashalBooks.com

انتساب

میں ان تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے مجھے روشنی کی راہ دکھائی اور اس کتاب کے لکھنے کے قابل بنایا۔

ماں کے نام جس کا انتقال اس وقت ہوا جب میری عمر صرف چند ماہ تھی۔

کزن، بھائی اور اپنے پورے خاندان کے نام۔

ان تمام لوگوں کے نام جو ان تضادات کا شکار ہوتے ہیں۔

MashalBooks.com

پیش لفظ

عرب معاشرے میں عورت جس دکھ اور اذیت سے گذر رہی ہے اس کا اظہار عرب ادب میں اب پوری طرح سے ہو رہا ہے۔ ناول، کہانی، افسانہ، شاعری اور تحقیقی مقالات میں عورت اور سماج سے متعلق رشتوں پر ادیب و شاعر اور محقق تفصیل سے لکھ رہے ہیں۔ خصوصیت سے نئی تعلیم یافتہ خواتین نے جب سے اس موضوع پر لکھنا شروع کیا ہے عورتوں کی تحریک کو اس سے ایک نئی تقویت ملی ہے کیونکہ جب عورتیں اپنی کہانی خود بیان کرتی ہیں تو ان کے شعور میں صدیوں کی دبی ہوئی اور کچلی ہوئی آوازیں ہوتی ہیں اور جب ان میں غم و غصہ دونوں مل جائیں تو ان کی آواز میں بڑی طاقت آ جاتی ہے۔

مرد نے عورت کو اس طرح سے پس ماندہ بنایا ہے اور اس کی سماجی حیثیت کو اس قدر کم کر دیا ہے کہ وہ دوسروں کی سرگرمیوں اور اس کی زندگی سے بالکل غائب ہو گئی ہے۔ پردہ نے عورت کو سماج سے کاٹ کر چار دیواری میں قید کر دیا ہے اور اس کی پوری زندگی سمٹ کر اس چار دیواری میں محدود ہو گئی اور وہ اس سے بے خبر ہو گئی کہ ان دیواروں کے پرے بھی ایک وسیع دنیا ہیا--پھیلی ہوئی، محیط اور خوبصورت- دنیا سے بے خبری نے اسے کم علم بنا کر اس کے ذہن کو سکیڑ کر رکھ دیا، کیونکہ اس کے تجربات اس کے گھٹے ہوئے ماحول تک محدود ہو کر رہ گئے۔

جب اسے اس چار دیواری سے باہر نکلنے کی اجازت بھی ہوتی ہے تو اس شکل میں کہ وہ برقعہ اوڑھ کر یا اپنے جسم کو چادر سے چھپا کر باہر نکلے۔ جب وہ اس شکل میں مرد کی دنیا میں آتی ہے تو وہ ایک نہ نظر آنے والی، غائب مخلوق ہوتی ہے۔ کیونکہ اسے کوئی

دیکھ نہیں سکتا، دنیا اس سے بے خبر ہوتی ہے، اور وہ کپڑوں میں لپٹی لپٹائی ان جانی مخلوق کی طرح گھومتی ہے جیسے کسی دوسرے سیارے کی کوئی مخلوق۔

پردہ اور برقعہ دونوں عورتوں کی شخصیت کو کچل کر رکھ دیتے ہیں۔ اس کی ابھرتی ہوئی شخصیت ان کے بوجھ تلے دب کر کچل دی جاتی ہے۔ اس میں حالات سے مقابلہ کرنے کی ہمت باقی نہیں رہتی اور وہ مردوں کی محتاج ہو کر رہ جاتی ہے۔ ان کی ہمت کی اور بہادری کی محتاج۔ اور یہی وہ مقصد ہے کہ جو مرد معاشرہ پورا کرنا چاہتا ہے۔ تحفظ اور سلامتی کی قیمت غلامی کی شکل میں وصول کی جاتی ہے، اور یہ تحفظ و سلامتی بھی عورت کو مرد کی شرائط پر ملتی ہے۔

اس لئے عرب معاشرہ میں عورت مرد کی محتاج ہے۔ باپ، بھائی، شوہر اور بیٹا یہ اس کے محافظ اور سرپرست ہوتے ہیں۔ اس کی اپنی کوئی زندگی نہیں ہوتی، وہ ان مردوں کی خواہشات کے مطابق اپنی زندگی ڈھالتی ہے۔ ان کی ضروریات کے مطابق اپنی عادتوں کی تشکیل کرتی ہے، بحیثیت عورت کے اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔

جب عورت کی صلاحیتوں اور توانائیوں کو اس طرح سے ختم کر دیا جائے تو پھر عورت کی ضرورت کس کام کے لئے باقی رہ جاتی ہے۔ صرف جنسی تسکین اور افزائش نسل کے لیے ـــــ اس سے زیادہ عورت کی توہین اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس ذات کی پہچان کو ختم کر کے ـــــ اور اسے انسان کے درجہ سے گرا کر اسے محض بچہ پیدا کرنے کا کام سپرد کر دیا جائے۔

عورت کے ساتھ یہی ایک المیہ ہے کہ اسے اپنی شخصیت اور ذات کو پہچاننے اور اسے ابھارنے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ باپ کے گھر میں وہ باپ اور بھائیوں کے تابع ہوتی ہے جب کہ اس کی ماں اسے غلامی کی روایات میں ڈھالنے کی تربیت دیتی ہے تا کہ سماج کی روایات کے مطابق وہ ایک کامیاب زندگی گزار سکے۔ شادی کے بعد وہ شوہر، ساس، نندوں اور شوہر کے رشتہ داروں میں گھر جاتی ہے جس کی وجہ سے شوہر اور بیوی کے درمیان رشتہ ابھرنے نہیں پاتا۔ اس کی اپنی کوئی دنیا بننے نہیں پاتی۔ اس کے اور شوہر کے درمیان ایک دیوار حائل رہتی ہے، اور شوہر و بیوی دونوں قریب ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہوتے ہیں۔

MashalBooks.com

اگرعورت ان روایات سے بغاوت کی جرات کرے تو اس کی سزا بڑی بھیانک ہوتی ہے۔ اسے معاشرے سے کاٹ کر بے غیرت اور فحاشہ بنا کر زندہ درگور کر دیا جاتا ہے۔ اس کے لئے کوئی راستہ سوائے اس کے نہیں چھوڑا جاتا کہ وہ گھٹے ہوئے ماحول میں سسکتے ہوئے زندگی گزارے۔

جب عورت باشعور ہو جائے، اور وہ حالات کے ظلم کو سمجھ جائے تو پھر اس کے لئے کون سا راستہ ہوتا ہے۔ اس وقت جبکہ اس کی تمام راہوں کو محدود کر دیا جاتا ہے۔ تو پھر وہ بغاوت کرتی ہے، تمام نتائج سے بے پرواہ ہو کر، عورت کی یہ بغاوت اس میں غم وغصہ اور جذبات کی شدت کو پیدا کرتی ہے اور یہ وہ موقع ہوتا ہے کہ اس کی شخصیت کے چھپے ہوئے تمام پہلو ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ اس کی توانائی، طاقت اور خود اعتمادی جو اس کے اندر سوئی ہوئی ہوتی ہے وہ بیدار ہوتی ہے اور بغاوت عورت کی شخصیت کی نئے سرے سے تشکیل کرتی ہے، اس کو ابھارتی ہے، اسے سنوارتی ہے، اور خوبصورت بناتی ہے۔ بغاوت میں عورت کی نجات ہے۔ اور بغاوت ہی اس کے خوشگوار مستقبل کی ضمانت ہے۔

علی غالم کا یہ ناول اسی بغاوت کی راہ دکھاتا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی

لاہور 23 مئی 1990ء

MashalBooks.com

فائزہ ٹیکسی کے شیشے سے باہر جھانک رہی تھی لیکن اس کا ذہن ابھی تک حمام میں پیش آنے والے واقعات میں الجھا ہوا تھا۔ چمکتی ہوئی دھوپ، گہرا نیلگوں آسمان، اس کا محبوب شہر اور نہ ہی بے پناہ ہجوم اس کی توجہ کو جذب کر سکا تھا۔ ٹیکسی رینگتی ہوئی ایک چوراہے میں رک گئی۔ گیلریز سے صرف دو قدموں کے فاصلے پر برقعوں میں چھپی ہوئی بوڑھی عورتیں ادھر ادھر گھوم کر سونے کے سمگل شدہ ہار اور انگوٹھیاں بیچ رہی تھیں۔ فائزہ کی نگاہیں دو نقاب پوش لڑکیوں پر جم گئیں۔ لگتا تھا کہ وہ جیولر کی کھڑکی سے چمٹی ہوئی ہیں تاکہ کوئی انہیں زیور منتخب کیے یا کم از کم اسے پسند کیے بغیر دھکا دے کر ہٹا نہ دے۔ فائزہ کو یہ دیکھ کر پہلے سے بھی زیادہ افسوس ہوا کہ جوان لڑکیاں برقع پہنے ہوئے ہیں۔ خیر ایک بات یقینی تھی اور وہ یہ کہ وہ خود کبھی برقع نہ پہنے گی۔ پردہ اسے عورتوں کا ماضی یاد دلاتا تھا اور وہ حال میں جینا چاہتی تھی۔ یوں چہرہ چھپا لینا اسے اچھا نہ لگتا تھا، چاہے وہ کبھی کبھار مفید ہی ہو۔ دو مردوں نے ہونے والی اس دلہن کو دیکھا تو پسندیدگی کی ادا سے مسکرا دیے۔ ٹریفک اور سڑک پر بے نیازی سے ٹہلنے والے لوگوں سے بچتے بچاتے ٹیکسی پھر چلنے لگی۔ ان لوگوں کے لیے ہارن بجائے جاتے ہیں لیکن وہ اکڑتے ہوئے سڑک پار کر جاتے ہیں۔ ایسے لوگ ہمیشہ تھوڑے سے جھگڑالو اور بے راہ رو ہوتے ہیں۔ فٹ پاتھ پر دھوپ چمک رہی تھی۔ چند بھکاری درختوں کے پاس دھرنا مارے یوں بیٹھے تھے جیسے وہ دھوپ میں اپنے مقدر کو سلا رہے ہوں۔

فائزہ ٹیکسی میں اپنے والدین کے پاس واپس جا رہی تھی۔ خوش باش باتونی عورتیں اس کے ساتھ بیٹھی تھیں لیکن اب وہ اس سے بے نیاز ہو کر اپنی گپوں میں مگن تھیں۔ اسے بیتے دن یاد آئے جب وہ اپنی ماں کے ساتھ حمام کو جایا کرتی تھی۔ گرمی، بھاپ،

فربہ کولھوں اور درماندہ جسموں کے ساتھ ادھر ادھر گھومنے والی ننگ دھڑنگ عورتیں۔ دوشیزاؤں اور بچوں کے دلآویز بدن۔ مستقبل کی دلہنوں کا طواف کرتی ہوئی رشتے کرانے والیوں کی متلاشی نگاہیں اور جی بھر کر پانی سے کھیلنے کی یادیں اس کے ذہن میں گردش کرنے لگیں۔ عورتیں رگڑ رگڑ کر بچوں کو صاف کرتیں اور پھر جلد کو نرم و نازک بنانے والی لونگ اور لیموں سے چوری چھپے بنائی ہوئی کریم لگاتیں۔ ہاں وہ خوشی کے دن بیت گئے تھے اور رلانے کو ان کی یادیں رہ گئی تھیں۔ فائزہ کے لمبے ریشمی بال ماں نے نہیں بلکہ دلہنوں کا بناؤ سنگھار کرنے والی ماہر بوڑھی عورت نے کھولے تھے۔ فائزہ کو سختی سے اپنی ٹانگوں میں جکڑ کر اس نے بڑی توجہ سے اس کے بال دھوئے تھے۔ گردوپیش کے شور، ہاؤ ہو، بچوں کے جھگڑوں، صابن اور سنگتروں کی میٹھی خوشبو سے فائزہ بے خود سی ہوگئی تھی۔ لیکن وہ خفا بھی تھی۔ ماں اسے دیکھ کر مسکرائی۔ اس کی آنکھوں میں کوئی الجھن تھی۔

''تم خوش تو ہو ناں بیٹی؟''

فائزہ کہیں اور کھوئی ہوئی تھی۔ گرمی، بھاپ، تیز خوشبو اور صابن والے پانی سے اس کی نظریں دھندلا گئی تھیں۔ مشاطہ مستعدی سے اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھی۔ فائزہ کے خیالوں سے بے نیاز وہ اس کی صفائی اور حسن پر توجہ دے رہی تھی۔ اس نے فائزہ کے کپڑے اتار کر فرش پر رکھے اور اسے پیٹ کے بل لیٹنے کو کہا۔ قدرے تذبذب کے بعد فائزہ نے یہ بات مان لی، بوڑھی عورت نے نہایت ملائمت سے اسے نہلایا۔ پیار سے اسے یوں تھپکا جیسے وہ اس کے کنوارے بدن کو انجانی مسرتوں سے آشنا کروانا چاہتی ہو۔

برہنہ اور پریشان فائزہ کا گرمی سے پہلے ہی دم گھٹ رہا تھا۔ اس برتاؤ پر وہ جھنجھلا گئی۔ اپنے اندر بغاوت اور غصے کی شدت پر اسے قدرے تعجب بھی ہوا۔ یہ منہ زور جذبے اس کے لیے بالکل انوکھے تھے۔ پہلے کبھی اس قدر شدت سے ان کا تجربہ نہ ہوا تھا۔ وہ مشاطہ پر چھینٹے اڑاتی ہوئی جلدی سے اٹھی۔ لیکن مشاطہ کو اس بات کی پروا نہ تھی۔ وہ تو بس اس بات پر خوش تھی کہ اپنا کام اس نے اچھی طرح کرلیا ہے۔

''ہفتے کے روز یہ دوشیزہ عورت بن جائے گی۔ ہاں تمہارا حسن سب سے بڑھ کر ہوگا۔''

اس لمحے فائزہ نے ایک اجنبی نوجوان عورت کو دیکھا جو تعریف اور سنجیدگی کے

ملے جلے انداز میں اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی نظریں اس قدر تیز تھیں کہ فائزہ کو یوں لگا جیسے وہ اپنے جسم کے ہر حصے میں انہیں محسوس کر سکتی ہو۔ تب بوڑھی عورت کے تجربہ کار ہاتھوں نے اسے گیلے فرش پر لٹا دیا۔ اب بال صاف کرنے کی اذیت شروع ہوئی۔ ہاں اذیت۔ فائزہ کے لئے تو یہ لفظ بھی کافی نہ تھا۔ کنواریوں کو نہلانے والی بوڑھی عورت کو یہ کام ضروری اور بے ضرر لگتا تھا، لیکن فائزہ کے لئے اذیت سے کم نہ تھا۔ اس نے ہولے ہولے اس کی ٹانگوں، بازوؤں اور چہرے پر کریم ملی۔ وہ بھینچی ہوئی مٹھیوں، بند ہونٹوں اور سمٹے ہوئے پٹھوں کے ساتھ آنسو روکے بیٹھی رہی۔

اس نے گنگنانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن فائزہ بوڑھی عورت کے برتاؤ پر اس قدر نالاں تھی کہ اس نے گیت پر کوئی توجہ نہ دی۔ آنسو روکنا اب زیادہ مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ ماں قریب آئی۔

''اچھا اچھا بیٹی۔ بس اب یہ کام ختم ہونے کو ہے۔ یہ اتنی مصیبت بھی تو نہیں۔''

ماں نے ملائم سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''میری جان تم اس قدر خوبصورت ہو جاؤ گی۔''

بوڑھی عورت اپنے کام میں مگن تھی۔ اس نے بھویں درست کیں۔ اس کی ماں حمیرہ بھی مشاطہ کی طرح مطمئن دکھائی دیتی تھی۔ اس نے فائزہ کو اس کے کپڑے اور جوتے دیئے۔ دونوں عورتیں تالیاں بجا کر پسندیدگی کا اظہار کرنے لگیں۔

لیکن اب وہ ٹیکسی میں بیٹھی شہر سے گزر رہی تھی۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے کوئی ان دیکھی قوت اسے کھینچ رہی ہو۔ جیسے وہ اپنے آدرشوں، خدشوں اور آشاؤں سے بے نیاز خواب میں چل رہی ہو۔ ٹیکسی میں بیٹھی عورتیں باتوں میں مصروف تھیں۔ چونکہ وہ ایک شاندار شادی کی تیاری کر رہی تھیں۔ اس لیے شادیوں کے قصے چھڑ گئے۔

''انہوں نے اختر کو اپنی بیٹے دینے کا وعدہ کیا تھا، جب اس کی عمر صرف دس سال تھی۔ دس۔ لیکن پچھلے سال انہوں نے محمود سے اس کی شادی کر دی۔ فضل اس کے ماں باپ کے گھر گیا اور لڑکی کے باپ کو قتل کر دیا۔ ہائے، ہائے۔ لیکن غلطی ان کی بھی تو......''

بوڑھی مشاطہ نے بدروحوں کو بھگانے کے لیے فائزہ کے پاؤں تلے نمکین پانی

MashalBooks.com

چھڑ کا تھا۔ وہ اس لڑکی سے بہت متاثر ہوئی تھی جو اب شادی کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ شادی اس کے لیے مہم سے کم نہ تھی۔ بس یہ ہے کہ کسی کو لکی نمبر مل جاتے ہیں اور کسی کو غلط۔ عادت کے مطابق اسے اپنی شادی یاد آنے لگی۔ پچاس سال پہلے۔ پچاس سال۔ پچاس برسوں میں کیا کچھ نہیں ہو جاتا۔ جنم، موت، شادیاں، طلاقیں، خوشیاں، دکھ۔ یہی زندگی ہے۔ خدا اسے بہت سے بچے دے اور جنگ سے محفوظ رکھے۔ کیونکہ جنگیں شوہر چھین لیتی ہیں اور بچے بھی۔ پھر ان کی پرورش کے دکھ اٹھانے کا فائدہ ہی کیا ہے۔ فائزہ کو روانگی کے وقت بوڑھی عورت کی نظریں یاد تھیں۔ عجیب و غریب۔ محبت بھری۔ خوش بھی اور اداس بھی۔ نا قابل فہم۔ ٹیکسی کے شیشے سے شہر کے مناظر تیزی سے گھرتے دکھائی دے رہے تھے۔ خشک کرنے کی خاطر کھڑکیوں میں کپڑے اور کمبل کسی بڑے دن لہرانے والے جھنڈوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ دیواریں سرخ اور ہلکے ارغوانی بوگن ویلیا کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ بغلی سڑک سے سمندر کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔

سمندر۔ ہائے۔ اس کے بس میں ہوتا تو ٹیکسی میں بیٹھنے کی بجائے وہ سمندر میں نہاتی اور ساحل پر ٹہلتی۔ کیا اس کے ہونے والے شوہر ہارون کو سمندر پسند ہے؟ وہ فرانس میں رہ چکا تھا اس لیے اسے ماڈرن تو ہونا ہی چاہیے۔ ماڈرن ہونے کا مطلب اس کے نزدیک یہ تھا کہ سب کچھ ممکن ہے۔ پھر اسے ماڈرن خیال کرتے ہوئے وہ خیالوں کی دنیا میں کھو گئی۔ اس کے پاس بیٹھی ہوئی عورتیں اب ادھر ادھر کی ہانک رہی تھیں۔ باتونی عورتیں مل بیٹھنے پر، تقریب میں شریک ہونے پر خوش تھیں۔'

نیم برہنہ ہارون مردوں کے حمام سے نکل کر چٹائی پر بیٹھ گیا۔ ایک بوڑھا مالشیا خوش مزاجی اور کسی قدر شرارت آمیز نظروں سے اس کی جانب لپکا۔

''اچھا تو بیٹا تمہاری شادی ہو رہی ہے۔''

ہارون نے سر ہلایا۔ مالشیا اس کی طرف بڑھا۔

''میرے بچے خدا تمہیں سکون اور خوبصورت بچوں سے نوازے۔''

''شکریہ۔''

''زیادہ بچے نہیں۔ کہتے ہیں ناں بچے پیدا کرنا سہل ہے۔
--لیکن روزی کمانا دشوار ہے۔ سمجھے؟''

MashalBooks.com

ہارون نے مسکراہٹ کے ساتھ بوڑھے کی تائید کی اور اپنے آپ کو اس کے مضبوط ہاتھوں کے سپرد کر دیا جو اس کی پشت پر ہولے ہولے مالش کرنے لگا۔

''میں نے بھی بیاہ کیا تھا۔ پورے شہر میں کھانا پکانے میں اس کا جواب نہ تھا۔ سچی بات ہے۔''

ایک لمحے کے لئے وہ یوں رکا جیسے ہارون کو اس بات کا یقین دلانا چاہتا ہو۔ پھر دونوں کام میں لگ گئے۔

''تمہیں حلوا پسند ہے؟''

ہارون کہنی کے بل اٹھا اور پہلو بدل کر ہنسنے لگا۔

''بالکل! میاں یہ کیا سوال ہوا؟ بھلا حلوا کس کو پسند نہیں؟''

''خیر حلوے کی تو وہ ملکہ تھی۔ سچی بات ہے۔''

اس نے دوبارہ مالش بند کی اور آہستہ سے سر ہلانے لگا۔

''اب وہ مر چکی ہے۔ گزشتہ سال عید کے روز اس کا انتقال ہوا۔ صبح کے وقت! بس وہ سوئی اور پھر نہ جاگی۔ حور کی طرح میرے بچے۔ حور کی طرح۔ سچی بات ہے۔''

پہلو بدل کر ہارون مالشیے کا منہ تکنے لگا جس پر زمانے کی سختیوں کی بجائے معصومیت اور شفقت کی چھاپ تھی۔ شرارت کا عکس بھی تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں کی چمک اداسی میں بدل گئی جیسے فرانس کی فضاؤں میں بادل آنکھ جھپکنے سے پہلے سورج کو ڈھانپ لیتے ہیں۔

''میرے بچے۔ ایماندار اور محنتی بیوی خدا کا سب سے بڑا تحفہ ہے۔'' چند منٹوں تک وہ ہارون کی مالش کرنے میں منہمک رہا۔

''تمہیں پتہ ہے۔ زندگی میں مَیں نے اسے اتنا نہیں چاہا جتنا اس کے مرنے کے بعد۔''

لگتا تھا کہ وہ ہچکچا رہا ہے۔

''اس کے بغیر۔ ہاں اس کے بغیر۔ دیکھو ناں بیٹا۔ اس کے بغیر۔ لگتا ہے کہ میں بھی نہیں ہوں۔ سچی بات ہے۔''

''اچھا چلو۔ مجھے تو تم بالکل زندہ لگتے ہو۔''

MashalBooks.com

''میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔میرے دو بیٹے تھے۔لیکن ایک جنگ میں مارا گیا۔آہ۔وہ اب نہیں۔ہم بچے پیدا کرتے ہیں۔ہزاروں مصیبتوں سے انہیں پالتے ہیں اور پھر وہ مر جاتے ہیں۔بس یونہی۔وہ بہت اچھا بیٹا تھا۔'' احتیاط کے ساتھ وہ ہارون کی مالش بھی کرتا جا رہا تھا۔

''میں یہاں ہفتے میں تین دن کام کرتا ہوں۔بیٹی میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ میرے دونواسے ہیں اور دونواسیاں۔ہاں۔بیٹا ایماندار بیوی اور فرمانبردار بچے خدا کا سب سے بڑا تحفہ ہیں۔''

بوڑھا اب خاموشی سے کام میں مگن تھا۔ہارون کو یہ سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ بوڑھے کے چہرے نے اچانک اسے فرانس میں اپنا روم میٹ یاد دلا دیا تھا جو اس کی طرح محنت مزدوری کی خاطر اپنے وطن سے آیا تھا۔تب وہ بار بار رونما ہونے والے تجربے کی زد میں ایک بار پھر آ گیا۔کسی جواز یا وارننگ کے بغیر دو الگ الگ لمحات ایک جیسی شدت کے ساتھ بیک وقت اس پر گزر رہے تھے، ماضی اور حال۔وہ اچھے خاصے گرم حمام میں تھا اور اسی لمحے دور دراز کے ٹھنڈے ٹھنڈے کمرے میں بھی۔بھاپ، گرمی، حمام۔پرسکون جسم، ٹھنڈا تکلیف زدہ اس نے بدن سکیڑا۔ٹوٹے ہوئے آئینے میں وہ خود کو دیکھتا ہے۔تھکا ہوا چہرہ دیکھ کر اسے مایوسی ہوتی ہے۔کمرے کا ایک ساتھی بھی اٹھتا ہے اور نیم خوابی کے عالم میں کافی تیار کرنے لگتا ہے۔حمام کی نرم گرمی اور مسکراتا ہوا بوڑھا مالشیا۔چاروں طرف بکھرے ہوئے قہقہے۔ہاؤ ہو۔دھند، ٹھنڈ۔پیرس کی مزدور بستیوں کی صبح۔ہارون اپنے اوورکوٹ کا کالر اٹھاتا ہے۔دور سے مضافاتی ٹرین کی سیٹی سنائی دیتی ہے۔ایک سیاہ ہیولا اس کی طرف بڑھتا ہے۔

''ارے ہارون!''

''ہوں۔''

''کیسے ہو؟''

''ٹھیک ہوں۔''

مضافاتی ٹرین کے ایک سٹیشن کا پلیٹ فارم۔چند جانے پہچانے چہرے جن سے روز ہی ملاقات ہوتی ہے۔ایک نوجوان عورت جس کی بچوں کی طرح چمکدار، ہلکی براؤن

MashalBooks.com

آنکھیں اور ملائم نظریں ہیں۔ پھر اسی درماندہ شخص کا چہرہ جو مقدر سنوارنے کے انتظار میں زندگی کے دن کاٹ رہا ہے۔ حمام، گرمی، خوشی، سردی، جانے پہچانے انداز میں ایک مزدور اس کے کندھوں پر ہاتھ مارتا ہے۔

''ارے محمود''

''محمود نہیں بھائی، ہارون۔ سو بار پہلے بھی بتا چکا ہوں۔''

''اچھا اچھا معاف کر دو یار۔ برا نہ مناؤ۔ بس اپنا حافظہ ہی ایسا ہے۔ سگریٹ جو زیادہ پیتا ہوں۔ ہاں ۶-۷-۱۴ کسے معلوم تھا کہ خدا اس کم بخت نمبر ۱۴ کو چاہتا ہے۔ ہاں ۔محمود۔ ہارون واقعی کسی کو پتہ نہ تھا۔ لیکن میں بھی یہ دوڑ جیت کر رہوں گا۔ یقین نہیں آتا؟ ارے کچھ بھی ہو ضرور جیتوں گا۔''

یہی وہ دن تھا جب اس نے پہلی بار اپنی ہونے والی بیوی کو دیکھا۔ گھر سے آنے والا خط اس نے کھولا تو ایک تصویر زمین پر گر گئی۔ اس نے فوراً اسے اٹھایا اور فائزہ۔ فائزہ کو دیکھا۔ اس نے خط اپنے ایک فرانسیسی مزدور دوست کی طرف بڑھا دیا۔

''میرے بھائی کا خط ہے۔ پڑھ کر سناؤ گے؟''

لیوسن نے خط لے لیا۔

''میں تمہیں وہی کچھ لکھ رہا ہوں جو والد اور والدہ نے لکھنے کو کہا ہے۔ یہاں سب لوگ خیریت سے ہیں اور تمہیں پیار بھیجتے ہیں۔ ہماری طرف موسم بھی بہت خوشگوار ہے۔ گرما کی آمد آمد ہے اور ہم ایک ماہ تک ساحل پر جا سکیں گے۔ تمہارے تمام دوست بھی سلام کہتے ہیں۔ علی اور نفیسہ مزے میں ہیں اور کہتے ہیں کہ پیرس سے آتے ہوئے تم ان کے لیے کچھ کپڑے لے آؤ۔ چند ماہ بعد میں ایک فیکٹری میں تربیت لینا شروع کر دوں گا۔ یہ فیکٹری حال ہی میں شہر کے قریب چالو ہوئی ہے۔ والد کہتے ہیں کہ اب تم تیس سے اوپر ہو گئے ہو اور والدین بوڑھے ہو گئے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ واپس آؤ اور شادی کرو۔ انہوں نے تمہارے لیے ایک خوبصورت بیوی بھی تلاش کر لی ہے۔ بڑے شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ سینے پرونے کا کام سیکھے ہوئے ہے۔ اس کا نام فائزہ ہے اور وہ قدیر کی بیٹی ہے۔ اس کی عمر سترہ برس ہے۔''

لیوسن ہارون کو دیکھ کر ہنسنے لگا۔ ہارون کو یہ بات اچھی نہ لگی۔

MashalBooks.com

''تمہاری بیوی سونے کا ایک ہار اور دو کنگن بھی لائے گی۔''

لیوسن ہنسا۔

''دیکھو بڈھے۔تمہیں ریس میں مقدر آزمانا ہوگا۔ میری مانو تو البرٹ سے کچھ اشارے سیکھ لو۔''

ہارون کو وہ لمحہ نہ بھولا۔اس نے لیوسن کی طرف سے منہ موڑ لیا تھا۔

''والد کہتے ہیں کہ جو رقم تم گھر بھیجتے رہے تھے۔اس کا کچھ حصہ انہوں نے بچا رکھا ہے۔باقی کا انتظام بھی ہو جائے گا۔''

خط واپس لے کر ہارون نے اسے جیب میں ٹھونس لیا۔لگتا تھا کہ اس وقت بھی وہ وہی حرکت دہرا رہا ہو۔آخر اس نے یہ بات کیوں مان لی؟ انکار کیوں نہ کر دیا؟ اس نے مالشیے کو دیکھا جواب بھی ہشاش بشاش تھا، وہاں حمام کی حرارت اور اطمینان میں۔

''تم فرانس میں کام کرتے تھے؟''

''ارے واقعی، میں فرانس میں کیسے کام کرتا تھا۔ پانچ سال۔ پہلے لیون میں پھر پیرس میں۔ پہلے میں تعمیرات کے اڈوں پر کام کرتا تھا پھر ایک مہربان نے مجھے چانٹلے میں گھوڑوں کی دیکھ بھال کا کام لے دیا۔اس نے کہا تھا کہ تم الجزائری فوجیوں کے ساتھ رہے ہو اس لیے تمہیں گھوڑے پسند ہوں گے۔واقعی مجھے وہ اچھے لگتے ہیں۔اس لیے میں اصطبلوں میں کام کرتا رہا۔گھوڑوں کو دانا ڈالتا۔کھریرا کرتا۔

وہ خاموش ہو گیا۔مالش بھی بند کر دی اور زور سے ہنسنے لگا۔

''اب میں انسانوں کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔''

''ہاں۔تم یہ کام خوب کرتے ہو۔''

ہارون بھی ہنسنے لگا۔''لیکن اب تم تھک گئے ہو گے۔مالش کرنا آسان تو نہیں۔''

''ہوں۔مگر مجھے عادت ہو گئی ہے۔البتہ ایک کے بعد دوسرے کی مالش کرنے سے پہلے اپنی طاقت بحال کرنا پڑتی ہے۔تم یہیں ٹھہرو۔ادھر ادھر کی سوچو۔یقین کرو کہ ایک ایماندار بیوی خدا کا سب سے بڑا تحفہ ہے۔''

مسکراتے ہوئے وہ ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔جہاں خود کو بحال کرنے کی غرض سے فرش پر لیٹ کر اس نے بازو پھیلائے اور آنکھیں بند کر لیں۔ہارون نے اس

کے بدن کی تازگی کو دیکھا۔ اپنا جسم بھی وہ ایسا ہی رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا؟ پیرس میں اس کی زندگی ایسی نہ تھی کہ جسم میں شباب کا رس باقی رہتا۔ اس نے پاؤں پسارے اور مالش کے بعد ملنے والے سکون میں کھو گیا۔ چاروں طرف اس کی طرح بہت سے مرد ستا رہے تھے۔ پاؤں پھیلائے ہوئے، سر تولیوں میں لپٹے ہوئے اور بدن چوغوں میں ڈھکے ہوئے وہ اپنے اپنے خیالوں کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ بعض سیاست یا تجارت پر باتیں بھی کر رہے تھے۔ ایک نے اپنے کان ٹرانسسٹر سے لگا رکھے تھے۔ خادم چائے اور کافی دے رہا تھا۔

ہارون نے چائے پی۔ اس وقت وہ بڑے خوشگوار موڈ میں تھا۔

فائزہ اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ اس نے قریب پڑے ہوئے کھلے سوٹ کیس کو ایک نظر دیکھا جو شادی کے تحفوں سے بھرا ہوا تھا۔ غیر ارادی طور پر اس نے ایک کپڑے کو چھو لیا۔ پھر اس نے ایک نگینہ اٹھایا اور وہیں رکھ دیا اور طلائی ہار کو دیکھنے لگی۔ سونے پر روشنی کی چمک سے بچپن کی ایک بھولی بسری یاد اس کے ذہن میں مچلنے لگی۔ سورج سنگترے کے درختوں کے پتوں سے جھانک رہا تھا اور وہ اپنی سہیلی مریم کے ساتھ ایک درخت کے نیچے لیٹی تھی۔

''دیکھو دیکھو سنگترے کالے ہیں۔''

''سورج نے تمہیں چندھیا دیا ہے سنگترے تو سرخ ہیں۔''

''کالے!''

''سرخ!''

''کالے!''

''جھوٹی کہیں کی۔ سورج تمہیں نظر نہیں آتا تو پھر تم پکی جھوٹی ہو۔''

وہ ہنس دیں۔ سنگترے سرخ تھے۔ سنگترے کالے تھے۔

اسی لمحے ماں چند رشتہ دار عورتوں کے ساتھ اندر آئی۔ وہ سب مسکراتے ہوئے باتیں کر رہی تھیں۔ ان کے بعد دایہ داخل ہوئی۔ سب نے احترام کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ دایہ فائزہ کی طرف بڑھی جو زمین پر نظریں گاڑے ہوئے تھی۔ ماں نے پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''میری بچی۔ میری جان۔''

دایہ دائیں طرف بیٹھ گئی اور پیار کے انداز میں اس نے فائزہ کو اپنے بازو میں سمیٹ لیا۔

''اب تم عورت بننے والی ہو۔ سنا ہے تمہارا شوہر بہت خوبصورت ہے۔''

''میری بچی۔ میری جان۔''

فائزہ نے اپنی ماں کی طرف دیکھا نہ ہی دایہ کی طرف۔ آنکھیں نیچی کیے وہ بے چینی سے انتظار کرتی رہی۔

''میری بچی۔ میری جان۔'' اس نے کہا۔

''سنا ہے اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ بہت سا سفر کیا ہے۔ اس لیے وہ زندگی کو سمجھتا ہے۔ مرد کے لیے یہ اچھی بات ہے۔ عورت ایسے مرد کے ساتھ خوش رہ سکتی ہے۔''

ان جملوں کے فریب میں آنے کی بجائے فائزہ اور بھی پریشان ہوگئی۔

''میری بچی۔ میری جان۔''

حمیرہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ اس کی بیٹی کنواری تھی۔ خیر اسے تو یہ معلوم ہی تھا۔ لیکن سب کے سامنے اس کی تصدیق لازمی تھی اور خاندانی وقار کے لیے اس کا باقاعدہ اعلان بھی درکار تھا۔ فائزہ اب بھی زمین پر نظریں گاڑے ہوئے تھی۔ ہاں اس قسم کی باتوں سے اسے شدید نفرت تھی۔ روح کی پوری قوت کے ساتھ وہ اس 'تصدیق' کو مسترد کرتی تھی۔ اسے یہ ناقابل برداشت اور ہتک آمیز گھاؤ محسوس ہوتا تھا۔ لیکن جانتی تھی کہ رواج یہی ہے۔ ان گنت صدیوں سے عورتیں اس کی بھینٹ چڑھتی رہی ہیں۔ لیکن کیا یہ جواز کافی ہے؟ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ شادی تک کے ہر لمحے سے اسے کس قدر گھن آئے گی۔ کاش یہ سب کچھ جلدی سے ہو جائے یا پھر ہم اسے جلدی سے ختم کر دیں۔

ماں اور دوسری عورتیں فائزہ کو لے کر باہر چلی گئیں۔

گڑیا کی مانند فائزہ کئی ہاتھوں سے گزری۔ اسے پوشاک پہنائی گئی اور میک اپ کیا گیا۔ تمام زاویوں سے عورتوں نے اس کے روپ کو دیکھا۔ آخر میں وہ مل کر اس کا جائزہ لینے لگیں۔ اس کے حسن کی تعریف کی۔ خوشی سے ہنسیں اور آئینے کے پاس لے گئیں۔ فائزہ نے خود کو روبرو دیکھا تو پہچان نہ سکی۔ اس نے اپنی انگلیاں بھنوؤں پر

پھیریں جن کی تراش خراش نے چہرے کا روپ بدل دیا تھا۔عورتیں خوشی سے ہنسنے لگیں۔ وہ آئینے کے روبرو خاموش کھڑی رہی۔عورتیں اس کی مسکراہٹ کی منتظر تھیں لیکن اس کے ہونٹوں میں کوئی جنبش پیدا نہ ہوئی۔ وہ اس طرح بن ٹھن کر پہلی بار اپنے شوہر کے سامنے جانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ تو سادگی اور روزمرہ کے انداز میں اس سے ملنے کی خواہاں تھی۔ ویسے یہ لباس اسے پسند تھا۔خوبصورت لگتا تھا۔ ایسے ہی دلکش لباس تیار کرنے کی خاطر اس نے سلائی کا کام سیکھا تھا۔ فائزہ نے وہ دن یاد کیا جب اس نے اپنے تخیل سے ایک لباس کا ڈیزائن تیار کیا تو ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگئی تھی۔

''یوں خود کو تھکانے کا کیا فائدہ؟ تمہارے خیال میں یہ کیا ہے؟ کس لئے ہے؟''

اسے اس ہنسی پر اپنا غصہ بھی یاد تھا۔

اس نے آہستہ سے اپنی نظریں آئینے سے ہٹا لیں جیسے اپنے عکس سے اسے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ حیران عورتیں خاموش ہوگئیں۔ یہ حیا ہے یا اداسی؟ وہ سب حمیرہ سے آنکھیں چرا رہی تھیں تاکہ اس لمحے کی سنگینی بڑھ نہ جائے۔ واقعی۔ آج کی نئی نسل کو کون سمجھ سکتا ہے؟

فائزہ عروسی جوڑے میں سمٹی ہوئی تھی۔ مہندی کا پیالہ لیے ماں کمرے میں داخل ہوئی۔ رنگ برنگے کپڑوں میں سجی ہوئی دوسری عورتیں بھی اندر آگئیں۔

شادی کے زیورات سے لدی پھندی انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ایک دوسرے کی تعریف کی اور خامیاں بھی نکالیں۔ ان میں سے بعض پرانے زمانے کی پریاں لگ رہی تھیں۔ بڑے کمرے میں رکھے ہوئے گدوں پر وہ شاہانہ انداز میں براجمان ہو گئیں۔ لباس کی طرح ان کی چادریں بھی بیش قیمت تھیں۔ فائزہ کو دیکھ کر وہ مسکرائیں تو اس نے ہلکا سا جوابی اشارہ دیا۔ نیلی مخمل کے لباس میں حمیرہ آستینیں اوپر چڑھا کر ہوشیاری سے اپنی بیٹی کے ہاتھوں پر مہندی لگانے لگی۔

''میری جان تم لاکھوں میں ایک ہو۔''

فائزہ مسکرا کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی جن پر مہندی کا رنگ چڑھا تھا۔ وہ خوش باش اور باتونی لڑکی تھی۔ لیکن آج وہ بالکل خاموش تھی۔ خدا جانے اسے کیا ہوا ہے۔ حمیرہ یہ ماننے پر تیار نہیں تھی کہ فائزہ خوش نہیں۔ یہ خیال اس کے ذہن میں پیدا ہوا تو اس نے جھٹک کر نکال دی۔

MashalBooks.com

''ذرا سہم گئی ہو میری جان ۔ میری لاڈلی ۔ ہاں میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا۔لیکن میں خوش تھی ۔ بہت خوش ۔البتہ ظاہر نہ ہونے دیتی تھی ۔تم بھی میرے جیسی ہو۔''

پھر بھی خود کو مطمئن کرنے کی خاطر اس نے پوچھ ہی ڈالا ''میری جان، کیا تم خوش ہو؟''

فائزہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ابھی تک وہ اپنے ہاتھوں کو گھور رہی تھی ۔لمحہ بھر کے لیے اس کا دل چاہا کہ اس کا شوہر آئے اور جلدی سے اس جھمیلے سے نجات دلائے ۔شوہر۔ جسے اس نے دیکھا تھا نہ اس کے بارے میں کچھ جانتی تھی ۔ابھی وہ ایسے ہی تھا جیسے اس کا کوئی وجود نہ ہو۔ ایک ناقابل برداشت عدم موجودگی اور ہر شے کی ناقابل برداشت موجودگی فائزہ سے اس کی بیوی بن جانے کا تقاضہ کر رہی تھی ۔ وہ نہ جانتی تھی کہ خود اس کے ہونے والے شوہر سے اس کا میاں بننے کے لیے کیا تقاضہ کیا جارہا ہوگا۔

تحفے پیش کرنے کا مرحلہ آن پہنچا۔مسکراتی ہوئی ایک خاتون نے بڑی سے ٹرے پر ایک بنڈل رکھا اور ہزاروں دعائیں دے ڈالیں ۔ ایک اور عورت نے چند روپے پیش کیے۔حمیرہ نے جو ابھی تک احتیاط سے مہندی لگا رہی تھی ، رقم کا اعلان بلند آواز میں کیا۔ پھر مسکرائی اور جھک گئی ۔عورتیں خوشی سے شور مچا رہی تھیں ۔ بت بنی فائزہ سب کچھ دیکھتی اور سنتی رہی ۔ ہاؤ ہو تکلیف دہ ہوتی جارہی تھی ۔اس کے آنسو ضبط سے باہر ہورہے تھے ۔صرف رشتے کی ایک سن رسیدہ بہن نے یہ معاملہ بھانپ لیا۔ وہ آگے بڑھی، ہمدردی کی نظروں کے ساتھ اس نے فائزہ کے رخسار کا بوسہ لیا اور اوپر جھک کر اس کے کانوں میں سرگوشی کی ۔

''میری حور، زندگی پر تجھے مسکرانا چاہیے۔ ورنہ زندگی دھوپ میں پڑی ہوئی بھیڑ کی پرانی کھال کی طرح چڑ مڑ ہو جائے گی ۔''

فائزہ ہنسنے لگی ۔

''دیکھا، دیکھا تم نے ۔ہم بس یونہی ہنس دیتے ہیں ۔ پھر ہر شے تمہارے لباس کی طرح گلابی ہو جاتی ہے ۔ میری مانو ۔زندگی پر تمہیں مسکرانا ہی ہوگا ۔''

فائزہ کے رخسار پر اس نے ایک تھپکی دی ۔ پھر اس نے تمام دوشیزاؤں کو بلا کر ان میں مہندی تقسیم کی تا کہ ان کے بیاہ بھی جلد ہوں ۔ ہاتھ پھیلائے ہنستی ہوئی وہ بھاگ گئیں ۔

فائزہ کو مریم دکھائی دی جو جلدی سے اس کی طرف آ رہی تھی۔ بغل گیر ہو کر دونوں محبت بھری گہری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ انہیں ایک دوسرے کا حال جاننے کے لئے لفظوں کی حاجت نہ تھی۔ مریم نے فائزہ کی پریشانی کا اندازہ کرلیا۔ وہ اس کی آشاؤں اور خوابوں سے بے خبر نہ تھی اور اپنا مقدر قبول کرنے میں اس کے انکار کو بھی سمجھتی تھی۔ لیکن اب۔ اس مرحلے پر بھلا وہ کیا کر سکتی تھی؟ تبدیلی محال تھی۔

اس کی چھوٹی کزن لیلیٰ نے موسیقی کی لہروں پر رقص شروع کر دیا۔ بسنتی اور روپہلے دوپٹے میں لپٹے ہوئے اس کے کولھے، بازو، نازک ہاتھ، دلآویز ادائیں اور موسیقی کی کشش نے مل کر فائزہ اور مریم پر جادو کر دیا۔ دوسری لڑکیاں بھی رقص میں شریک ہوگئیں۔ عورتیں تال پر تالیاں بجانے لگیں۔ مریم اپنی سہیلی کو بھی رقص میں شامل کرنا چاہتی تھی۔ لیکن فائزہ اپنی جگہ جمی رہی۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں ایک کپڑے میں بندھے ہوئے تھے۔ وہ روایت کی اسیر تھی۔ اتنے میں عائشہ آگے بڑھی اور اس نے مریم کو رقص میں دھکیل دیا۔ وہ اس سازش کو ختم کرنا چاہتی تھی۔ چھٹی حس نے اسے بتا دیا تھا کہ بہو کو ان کنواری سہیلیوں سے دور رکھنا ضروری ہے جو ابھی کچھ عرصے تک شادی کے بندھن سے آزاد رہیں گی اور جن میں سے بعض ابھی سکول جاتی تھیں۔ فائزہ نے مریم کے پیچھے اپنی ساس کو دیکھا تو ایک شریر مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر مچل گئی۔

عائشہ خوبصورت عورت تھی۔ پچاس کے لگ بھگ ہوتے ہوئے بھی وہ کم عمر دکھائی دیتی تھی۔ قدرے موٹاپے کے باوجود وہ چست اور پھرتیلی تھی۔ عورت کے ناتے حاصل ہونے والے اختیارات پر اسے ناز تھا۔ اس کے مقابلے میں حمیرہ دور اندیش اور سنجیدہ دکھائی دیتی تھی۔ ویسے وہ تھی بھی شفیق، ہمدرد، پرسکون، مطمئن اور دوسروں کا خیال رکھنے والی۔ الجھنیں پیدا کرنے کے بجائے انہیں حل کرنا اسے پسند تھا۔ اس کی موجودگی سکون بخش تھی۔ وہ کم بولتی، کم سنتی اور شاذ و نادر ہی اپنی رائے دیتی تھی۔ اپنی رائے کو اہمیت دینے سے زیادہ اسے شوہر کی مرضی کا خیال رہتا۔ ہر وقت مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر یوں کھیلتی جیسے زندگی نے اسے دکھوں سے محفوظ کر دیا ہو۔

دل ہی دل میں فائزہ نے ان دونوں عورتوں کا موازنہ کیا جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھیں۔ اس نے سوچا کہ اپنی ماں کے بغیر وہ اس عورت کے ساتھ کیسے رہے گی

MashalBooks.com

جو اس کی ساس بننے والی ہے۔ آخر اسے گھر کیوں بدلنا چاہیے؟ عورتوں کو ہمیشہ اپنے سسرال میں ہی کیوں رہنا پڑتا ہے؟ وہ خود کوئی فیصلہ کیوں نہیں کرسکتیں؟ آخر یہ کیوں نہیں ہوسکا کہ شوہر آئے اور اس کے خاندان کے ساتھ رہنے لگے؟ جانتی تھی کہ اگر اس نے یہ سوال اٹھائے تو اسے خاموش رہنے کو کہا جائے گا۔ بس عجیب سے خیالات۔ وہ کہیں کا نہیں چھوڑتے۔ اس کی ماں کہے گی۔ ہاں ہر شخص کے پاس کچھ عجیب وغریب خیالات ہوتے ہیں۔ اسے اپنے ان خیالات پر قابو پانا ہوگا۔ خاموش رہو۔ بہت سے دنوں تک وہ خاموش رہی تھی۔ جو کچھ وہ کہنا چاہتی تھی اس کی کسی کو توقع نہ تھی۔ اس بات نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سلسلہ یونہی دراز رہے گا۔ لمبے عرصے کے لیے۔ بہت لمبے عرصے کے لیے۔

اسے وہ دن یاد آیا جب مریم نے اس کا دل بہلانا چاہا تھا۔

''فائزہ، سچ کہو، تمہیں کسی سے محبت تو نہیں؟''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔''

''اچھا پھر تم اتنی اداس کیوں ہو؟''

''اس لیے کہ میں اس طرح شادی نہیں کروانا چاہتی۔ ابھی سکول جانا چاہتی ہوں۔ اپنی ماں کی طرح گھر کی چار دیواری میں قید نہیں ہونا چاہتی۔ کام کرنا چاہتی ہوں۔ پرانے زمانے کی طرح اب بھی یہ لوگ ہمارے لیے سب فیصلے خود کیوں کرتے ہیں؟''

مریم کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

''ہوں۔ مگر کب تک؟ ماں نے مجھ سے جواد کے بیٹے کا ذکر کیا ہے جو وزارت زراعت میں ملازم ہے۔ تعجب نہ ہوگا اگر......''

ایک جواں سال حاملہ عورت میلے کپڑے اور پانی کی بالٹی لیے آنگن میں سے گزری۔

''تم نے پہچانا نہیں، یہ میری بھابھی ہے۔''

فائزہ واقعی نہ پہچان سکی تھی۔ شادی کے آٹھ برسوں میں اس نے چھ بچوں کو جنم دیا تھا۔ چار مر چکے تھے۔ وہ ہر وقت اداس رہتی۔ مریم کبھی یہ بات نہ سمجھ سکی تھی کہ اس کے بھائی اور بھابھی کے درمیان گرم جوشی کیوں نہیں رہی۔

''نہ جانے کیوں میرا بھائی اس سے بڑی سختی سے پیش آتا ہے۔ وہ کوئی شکایت زبان پر لائے بغیر سب کچھ برداشت کر لیتی ہے بڑی صابر ہے۔''

''لیکن میں اس انداز سے جینا نہیں چاہتی۔''

''مگر فائزہ تمہارا شوہر تو فرانس میں رہ چکا ہے۔ وہ میرے بھائی جیسا نہ ہوگا! وہ تو باپ سے بھی زیادہ پرانی وضع کا ہے۔ ذرا سی تبدیلی اس کی برداشت سے باہر ہے۔ اس کا بس چلتا تو میں کبھی سکول میں قدم نہ رکھ سکتی۔''

فائزہ کی استانی مادام لوسی ابھی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر فائزہ اپنے خوابوں سے چونکی۔ وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھی، فائزہ کا بوسہ لیا اور اپنا تحفہ حمیرہ کو تھما دیا کیونکہ فائزہ کے بندھے ہوئے ہاتھ کچھ پکڑ نہ سکتے تھے۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو انہوں نے دل ہی دل میں یاد کیا کہ وہ زبردستی کی شادی کے کس قدر خلاف تھیں۔ اس کے خلاف اپنی جدوجہد یاد کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں اپنی بے بسی کا خیال بھی آیا کہ وہ روایت کے بندھن کو توڑ نہیں سکیں۔

مادام لوسی جانتی تھی کہ فائزہ نے اس کی طرح استانی بننے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر وہ کبھی اس کا اظہار کرنے کی جرات نہ کر سکی۔ لیکن شاید وہ ایسا کر سکتی تھی۔ فائزہ کے باپ کو رضامند نہ کر سکنے پر اسے اپنے آپ پر بھی غصہ آیا۔ اسے بخوبی احساس تھا کہ اس نے اپنی محبوب شاگرد کو مایوس کیا ہے۔ فائزہ خوش باش، زندہ دل، ذہین اور حساس ہوا کرتی تھی۔ ہر وقت پر جوش اور سرگرم رہتی۔ مادام لوسی خود کو ملامت کر رہی تھی۔ لیکن یہ حادثہ پہلی بار ہوا تھا اور نہ ہی بدقسمتی سے آخری تھا۔ ہاں کبھی کبھار وہ اپنی شاگردوں کے والدین کو آمادہ کرنے اور یوں ان کا مستقبل بدلنے میں کامیاب بھی ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن فائزہ کے معاملے میں اسے مکمل ناکامی ہوئی تھی۔ ان احساسات سے جان چھڑانے کے لئے اس نے محض یہ کہنے پر اکتفا کیا:

''تم کس قدر حسین ہو فائزہ۔''

فائزہ نے مشکل سے خود کو سنبھالا، مسکرانے کی کوشش کی اور آنکھیں نیچی کر لیں۔ مادام نے واقعی اسے مایوس کیا تھا۔ مگر وہ اسے کوئی الزام نہ دینا چاہتی تھی۔ مادام بھی اس کے گھر والوں کے آگے بے بس تھی۔ حمیرہ آگے بڑھی اور مادام کو ویسے ہی میز کی طرف لے گئی جیسے

عائشہ اور مریم کو لے گئی تھی۔ عائشہ کی طرح وہ بھی دلہن کو بچانا چاہتی تھی۔ اس نے مادام کو کیک اور مشروبات پیش کیے اور اسے مریم کے پاس چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔

حمیرہ نے بیٹی کی طرف دیکھا۔ وہ بندھے ہوئے ہاتھوں کو غور سے دیکھے جا رہی تھی۔ حمیرہ کو وہ دن یاد آ گیا جب اس کے شوہر نے خوش خبری سنائی تھی۔ وہ اپنی ننھی بچی کو بے نیازی کے ساتھ صبح کے معمولات سے گزرتی دیکھ سکتی ہے۔

''جلدی کرو۔ جان۔ ورنہ پھر لیٹ ہو جاؤ گی۔ جلدی کرو جلدی۔''

وہ شاید یہی لفظ آج کی صبح بھی دہرانا چاہتی تھی۔ اس کی بیٹی اس سے چھینی جا رہی تھی۔ وہ اس کے لمبے بالوں سمیت اسے دیکھ سکتی تھی۔

''میری شہزادی، تم نے ابھی بال تو سنوارے نہیں۔''

فائزہ کا بلند قہقہہ۔ ہائے وہ اس کی دلکش ہنسی۔

''مجھے آج اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو۔ بات کیا ہے؟''

''وہ۔ ہاں کچھ نہیں۔ بس۔ جلدی کرو۔''

وہ اسے بتانے کا حوصلہ نہ رکھتی تھی۔ اس کے باپ نے اسی شب ہونے والی شادی کا ذکر کیا تھا۔ فائزہ خاموش تھی۔ اچانک اس کا رنگ بدلنے لگا اور آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔

حمیرہ کو یاد آیا کہ مادام لوسی فائزہ کے متعلق بات کرنے آئی تھی۔

فائزہ اتنی اچھی طالبہ ہے۔ واقعی یہ شرم کی بات ہو گی کہ۔''

''مگر عورت کے لیے شادی سکول سے اہم ہے۔''

''ابھی وہ چھوٹی ہے۔ اس نے بہت کچھ سوچ رکھا ہے۔ علم سے اسے لگاؤ بھی بہت ہے۔''

''شادی زیادہ اہم ہے۔''

اس کا باپ بوسیدہ رسوم و رواج کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔

''فائزہ میں بڑی صلاحیتیں ہیں۔ وہ......''

''اس کی شادی ہو رہی ہے۔ عورت کی اصل جگہ گھر میں شوہر اور بچوں کے ساتھ ہے۔ وہیں اس کی صلاحیتوں کو کام آنا چاہیے نہ کہ کسی پیشے میں۔''

MashalBooks.com

''قدیر صاحب یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے خلاف نہیں۔ آج کے دور میں سب کو کام کرنے کی ضرورت ہے۔ عورتوں کو بھی۔''

''نہیں۔ نہیں۔ یہاں تو مرد بھی بے روزگار ہیں۔''

''لیکن عورتوں کے کام کرنے سے مردوں کی بے روزگاری نہیں بڑھتی۔ جناب حقیقت تو اس کے الٹ ہے۔''

''تم مجھے یہ بات ماننے پر مجبور نہیں کر سکتیں۔''

''پھر بھی سچ یہی ہے کہ اب عورتیں بھی پڑھنا، کام کرنا اور اپنا شوہر خود منتخب کرنا چاہتی ہیں۔''

''اچھا اگر ہم نے ہر معاملے میں گوروں کی نقل کرنی تھی تو پھر آزادی حاصل کرنے کا کیا فائدہ ہوا؟ نہیں مادام۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ میں زندگی کو خوب سمجھتا ہوں۔ میرا تعلق کسان گھرانے سے ہے اور برسوں تک میں ہوٹل میں کام کرتا رہا ہوں۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ ہم تو بس اپنی بچی کو خوش رکھنا چاہتے ہیں۔''

حمیرہ اس گفتگو کے دوران خاموش رہی تھی لیکن ہر لفظ اس کے حافظے میں نقش ہو گیا تھا۔ وہ رائے دینے کی مجاز بھی نہ تھی کیوں کہ اصول یہ ہے کہ باپ جو کچھ کرتا ہے وہی درست ہے۔ پھر بھی فائزہ کو ابھی مجبور کیوں کیا جائے؟ تھوڑے سے انتظار میں کیا حرج ہے؟ جلدی کس بات کی ہے؟

حمیرہ اور مادام لوسی دونوں اس واقعہ کی یاد میں کھوئی ہوئی تھیں۔ مادام کے لیے اس سے نجات پانا دشوار تھا۔ اسے خیال آیا کہ قدیر نے اسے کس طرح خاموش کر دیا تھا۔ اس کے فیصلے کس قدر اٹل تھے۔ اس کی خود اعتمادی کی بنیاد خانگی نظام کے احترام پر مبنی تھی جو صدیوں سے سب کی بھلائی کے تصور پر قائم ہے۔ مادام قدیر کو اپنا فیصلہ بدلنے پر آمادہ نہ کر سکی تھی۔ پھر آخر اس کا رویہ کیسے بدلے گا؟ کون بدلے گا؟ وقت؟ شاید۔ لیکن کتنا وقت؟ اسے محسوس ہوا کہ دنیا کے تمام قدیروں کو رویہ بدلنے اور یہ تسلیم کرنے پر مجبور نہ کیا جائے کہ جدید سماجی زندگی میں عورتوں پر ویسے اعتماد کیا جا سکتا ہے جیسے ان پر گھریلو زندگی کے لیے کیا جاتا رہا ہے، اس وقت تک عورتوں کا مقدر نہیں بدلے گا۔ ان خیالات کی یاسیت کو کم کرنے کی خاطر وہ یہ سوچنے لگی کہ شاید فائزہ کا شوہر اسے سمجھ سکے اور ان

تعصّبات سے محفوظ ہو جو عورتوں کی جائز آرزوؤں کو بھی کچل دیتے ہیں۔شاید؟

ہاؤ ہو بڑھتی جا رہی تھی۔زیادہ سے زیادہ لڑکیاں رقص میں شامل ہو رہی تھیں۔ حمیرہ نے سوچا کہ یہی وقت ہے کہ فائزہ کے ہاتھ پاؤں کھول دیے جائیں۔مہندی کا رنگ نکھر آیا تھا۔

حمیرہ نے بیٹی کو اس قدر پیار سے دیکھا کہ فائزہ بھی خوش ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس کا جی ایک کزن کے ساتھ رقص کرنے کو چاہا۔ اچانک اس کی نظریں ثمینہ کی متلاشی نگاہوں سے دوچار ہوئیں جو اس کی چھوٹی نند تھی۔اسے دیکھ کر وہ مسکرائی تو ثمینہ نے خوشی سے ہاتھ ہلایا۔ دونوں ایک دوسرے کی کشش محسوس کرنے لگیں۔ دونوں ایک دوسرے کو چاہیں گی۔بہنیں بن جائیں گی۔

ثمینہ اپنی ہونے والی بھابی کو رقص کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی کہ عائشہ کی ایک رشتے کی بہن کی نظریں اس پر پڑیں۔اسے ثمینہ خوبصورت اور شادی کے قابل لگی۔

''اری عائشہ تمہاری بیٹی تو ماشاءاللہ بڑی خوبصورت ہے۔''

عائشہ فخر سے مسکرائی۔ ویسے یہ بات درست بھی تھی۔ثمینہ کا چہرہ پرکشش تھا اور کردار بے داغ۔

''میری بہن کا ایک لڑکا ہے۔'

''ابھی وہ چھوٹی ہے۔خیر سوچیں گے۔ بزرگوں کی طرح ہمیں بھی بیٹیوں کی شادی اسی عمر میں کر دینی چاہیے۔آج کل عقلمندی کا تقاضا یہی ہے۔''

''میری منگنی تو دس برس کی عمر میں ہو گئی تھی۔اور خدا کی قسم مجھے کبھی اس بات پر افسوس بھی نہیں ہوا۔''

ثمینہ ناچنے والیوں کو دیکھ رہی تھی۔اسے کیا خبر تھی کہ ماں اور ایک عورت مل کر اس کے مقدر کا فیصلہ کر رہی ہیں۔اطاعت پسند طبیعت کی وجہ سے اسے ماں کے حاکمانہ رویے سے کبھی ٹھیس نہ پہنچی تھی۔ وہ ماں کو چاہتی تھی اور گھریلو امور میں اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتی تھی۔

حمیرہ بیٹی کو دیکھنے لگی جو اب خوش دکھائی دے رہی تھی۔رقص کی مسرت اس پر غالب آ گئی تھی۔ یہ بچے! آخر ان کے سر میں کیا سمایا ہوا ہے؟ ان کی اداسی۔ بادل کی

MashalBooks.com

طرح۔ چھوٹے چھوٹے بادلوں کی طرح پل میں ختم ہو جاتی ہے۔شاید اسی کا نام شباب ہے۔حمیرہ نے گہرا سانس لیا۔فائزہ خوش تھی۔اللہ تیرا شکر ہے۔لاکھ لاکھ شکر۔

اندیشوں اور دکھوں سے جان بچا کر فائزہ خوشی سے ناچ رہی تھی۔اسے خود فراموشی اور فرار کی جستجو تھی۔

شادی کے کھانے سے فارغ ہو کر مرد ہنسنے کھیلنے لگے۔بعض خوش گپیوں میں مصروف تھے۔بعض خوشی سے ناچ رہے تھے۔بوڑھی عورتیں خاموشی اور احتیاط کے ساتھ برتن دھو رہی تھیں۔مرد ان سے بے نیاز تھے۔وہ تو بس اپنے آپ میں مگن تھے اور مزے لوٹ رہے تھے۔ہارون نے سگریٹ سلگایا اور ناچ دیکھنے لگا۔وہ اس قدر بے نیازی سے کھڑا تھا جیسے کوئی تماشا دیکھ رہا ہو یا یہ اس کے کسی دوست کی شادی ہو۔

''ہارون تم ہو خوش قسمت۔''

اس کے ایک دوست صلاح نے رائے دی۔وہ مسکرایا لیکن خاموش رہا۔

''کاش میری بھی شادی ہو جائے لیکن یہ ہو نہیں سکتا۔میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔مہینوں سے بے روزگار بھی ہوں۔''

''بھائی آج خوشی کا دن ہے۔ایسی باتوں کو رہنے دو۔آج ہارون کی شادی ہے ناں۔''

''شاید ایک سال تک۔''

''ایک سال تک ہے۔صبر کیسے کرو گے؟''

تینوں مسکرا دیے۔شادی کرنا بھی عجیب ہے۔بیوی لاؤ اور بچے پیدا کرو۔ ہارون کا بس چلتا تو خوشی سے اپنی جگہ صلاح کو دولہا بنا دیتا۔ویسے اس نے یہ بات کہنے سے گریز کیا کہ صلاح اسے محض مذاق سمجھے گا۔یہ پہلا موقع نہ تھا جب ہارون کو احساس ہوا ہو کہ ہمیشہ سچ نہیں بولا جا سکتا۔وہ خاموش رہا۔ایک عورت ٹرے میں چار موم بتیوں کے ساتھ مہندی لیے پُر تکلف انداز میں ہارون کی طرف لپکی اور مسکراتے ہوئے اس کی دو انگلیوں پر رنگ لگا دیا۔

''خدا کرے یہ مہندی تمہارے لیے خوشی کا سبب بنے۔''

خدا کرے یہ مہندی تمہارے لیے خوشی کا سبب بنے۔اس سحر انگیز جملے کے ساتھ

ہارون کے ہاتھوں پر مہندی لگنے لگی۔ پھر رسم کے مطابق مردوں نے فرش پر بچھے ہوئے رومال پر پیسے پھینکے۔ پیرس میں ہارون نے اپنے دوستوں کی شادی کے موقع پر بارہا اس رسم میں حصہ لیا تھا۔

پیرس، اسے وہ دن یاد آیا جب وہ پہلی بار پیرس پہنچا تھا۔ چھوٹا سا سوٹ کیس لیے وہ کھڑا تھا۔ حیران و پریشان۔ اس شہر کی نئی دنیا اس کے لیے پرکشش تھی اور ستم گر بھی۔ برسوں کے قیام کے باوجود وہ ابتدائی تاثر زائل نہ ہوا تھا۔ پرکشش۔ستم گر۔

شہر کی شاہراہ عظیم الشان دکھائی دیتی تھی۔ موٹروں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔ پھر تارکین وطن کی گندی اور تاریک بستیاں۔ باپ اس کی واپسی پر رضامند نہ تھا۔ واپسی۔ٹھہرو۔

اس کا باپ دوستوں اور عزیزوں میں گھرا ہوا سگریٹ پی رہا تھا اور باتیں کیے جا رہا تھا، روایتی انداز میں بیٹے کی شادی ہونے پر وہ بہت خوش تھا۔ روایتیں ہی اس کا سرمایہ تھیں اور وہ ہر قیمت پر ان کو بچانا چاہتا تھا۔ بیٹے نے بھی بالآخر روایت کے آگے سرخم کر دیا تھا۔ یوں سماجی اور آبائی بنیاد مضبوط ہو رہی تھی۔ احمد سے باتیں کرنے والے اکثر مرد بھی اس سے متفق تھے۔ ان سب پر ایسے تکبر اور خود اعتمادی کا غلبہ تھا جو ان لوگوں کے حصے میں آتی ہے جو خود کو راستے پر سمجھتے ہیں۔

دولہا کے گھر کے سامنے ٹیکسیاں رک گئیں۔ بارات کے انتظار میں ہنستے گاتے ہمسائے دروازے پر جمع ہو گئے۔ شاندار کپڑوں میں ملبوس احمد آہستہ آہستہ اپنی بہو کی طرف قدم اٹھانے لگا جو ابھی ٹیکسی سے اتری تھی۔ لگتا تھا کہ دلہن کی ماں لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لیے اس کے پیچھے پیچھے رہنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔ احمد دلہن کو لے کر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک بوڑھی برقع پوش خاتون نے چاندی کے پیالے سے سنگترے کے پھولوں کا عرق دلہن، اس کی ماں اور پھر تمام مہمانوں پر چھڑکا۔ تماشائی اب خاموش ہو چکے تھے۔ راہب کی طرح احمد نے وہ تمام فرائض رواج کے مطابق ادا کیے جن سے اسے بے حد لگاؤ تھا۔ نئے خاندان کے سردار کی حفاظت میں فائزہ اپنے نئے گھر میں داخل ہوئی جسے وہ آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرات نہ کر سکی تھی۔ لیکن یہ رسمیں اس کے لیے سکون بخش نہ تھیں۔ وہ تو اور بھی بوجھل ہوئی جا رہی تھی۔ نیچے آنکھوں کے

ساتھ اس نے دیواروں پر لٹکنے والے استقبالیہ قالینوں کو دیکھے بغیر صحن پار کیا۔ زمین پر بچھے ہوئے قالین اس نے البتہ دیکھے تھے۔ باہر عورتیں خوشی سے شور مچا رہی تھیں۔

کمرے میں داخل ہونے کے بعد عورتوں نے دلہن کا لباس اتارنا شروع کر دیا۔ باہر مرد ابھی تک ہنس کھیل رہے تھے۔

تماشائیوں کی داد اور تالیوں کے شور میں محمود رقص کر رہا تھا۔ اسی جوش کی کیفیت میں اس نے اپنی واسکٹ اتاری اور تماشائیوں کی طرف پھینک دی۔ صلاح نے بمشکل اسے پکڑا اور ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

''مجھے نہیں پتہ تھا کہ محمود اس طرح ناچ سکتا ہے۔''

''ہمارا یار محمود تو ہر وقت جوش و خروش کی نمائش پر آمادہ رہتا ہے۔''

دوسرے لوگوں نے رقص بند کر دیا اور سب مل کر محمود کو داد دینے لگے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے دوبارہ ناچنا شروع کر دیا۔ ہارون یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر ایک عرصے سے اسے ناچنے کی امنگ نہ رہی تھی۔

عورتیں شبِ عروسی کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ انہوں نے فائزہ کے میک اپ کی نوک پلک سنواری۔ عائشہ آگے بڑھی اور اس نے برکت کے لیے ایک تعویذ اس کے گلے میں ڈال دیا۔ یہ تعویذ اس نے خاص طور پر اپنی بہو کے لیے حاصل کیا تھا۔ نیک شگون کی خاطر ایک لڑکے کو دلہن کے سامنے سے گزارا گیا۔ خدا کرے دلہن بہت سے بچوں کو جنم دے۔ ہاں بہت سے خوبصورت بچے۔ بہت سے لڑکے۔ بیٹے پوتے ہی سب سے بڑی نعمت ہیں۔

تھکی ماندی فائزہ گرد و پیش کے معاملوں سے بے نیاز دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے ذہن میں خلا سا تھا اور وہ بے ہوشی کی حد تک سراسیمہ تھی۔ عورتوں نے ڈھولک کی لے پر ایک دھیمے سروں کا گیت گانا شروع کیا۔ اب شادی کی رسوم کا آخری مرحلہ شروع ہونے کو تھا۔

احمد آرام سے اٹھا اور کمرے کو پار کر کے مردوں کی طرف نکل گیا۔ محبت آفرین احساس کے ساتھ ہارون اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے یہ بات اچھی لگ رہی تھی کہ باپ نے خاموش خود اعتمادی کے ساتھ اپنے تمام فرض ادا کر دیے ہیں۔ اس کی اپنی کیفیت

باپ سے بالکل مختلف تھی۔ اطمینان اور خود اعتمادی دونوں اس سے کوسوں دور تھے۔ باپ کی طرح اس نے کبھی حاکمانہ انداز نہیں اپنایا تھا۔ نہ ہی وہ باپ کے کسی عقیدے میں یقین رکھتا تھا۔ پھر بھی اس وقت اس کے طرزِ عمل سے یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے باپ سے ہر بات پر اتفاق رکھتا ہو۔ جیسے۔ ہاں جیسے فرانس میں اس نے اداکاری کا چلن سیکھ لیا ہو۔ جیسے وہ وہاں بالکل تنہا نہ رہا ہو۔ جیسے وہاں اسے حقیر نہ سمجھا جاتا ہو۔ جیسے وہ بہت خوش ہو۔

ہارون جانتا تھا کہ اس کا باپ عورتوں کو یہ بتانے گیا ہے کہ دیر ہو رہی ہے اور یہ کہ اب دلہا دلہن کے ملن کا وقت آ گیا ہے۔ دلہن سے ملنے کی اسے کوئی امنگ نہ تھی۔ اس لمحے یہ بات اسے ناقابلِ توجیہہ عیب محسوس ہوئی۔ وہ چاہتا تھا کہ کاش ایسا نہ ہوتا۔

احمد نے دلہن کے کمرے میں پاؤں رکھا تو عورتوں نے گانا بند کر دیا۔ اس نے سر کا ہلکا سا اشارہ دے کر دایاں ہاتھ دل پر رکھا اور بیوی کی طرف دیکھ کر کہنے لگا:

''بھلی مانس، اب بیٹے کو اندر لانا چاہیے۔''

''ابھی سے۔''

''تم اتنی باتونی ہو کہ وقت کا تمہیں خیال ہی نہیں رہتا۔''

احمد نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بی بیو، وقت ہو گیا ہے۔''

احمد باہر نکل گیا۔

کانپتی ہوئی فائزہ نے ماں کی آغوش میں پناہ ڈھونڈنا چاہی۔ حمیرہ نے اسے چوم لیا۔

''میری جان، میری بچی۔''

عائشہ نے بہو پر آخری نظر ڈالی۔ وہ مطمئن تھی۔ دلہن ویسی ہی بنی سنوری تھی جیسی کہ اسے ہونا چاہیے۔ حمیرہ کو لے کر وہ باہر آ گئی۔ اکیلی فائزہ اب کمرے کے درمیان میں کھڑی تھی جو اچانک گیتوں، آوازوں اور قہقہوں سے خالی ہو گیا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ پلنگ کی طرف بڑھی اور اس پر بیٹھ گئی۔ خاموش اور پریشانی کے عالم میں وہ محوِ انتظار تھی۔ میری جان۔ میری بچی۔ ماں کی سرگوشیاں۔ بس وہی کرنا جو تمہارا شوہر چاہے۔ بیٹی اسے ناراض نہ کرنا۔ اب تم عورت بننے والی ہو۔ اگر تم شوہر پر راج کرنا چاہتی ہو تو جونہی وہ تمہاری طرف بڑھے، اس کے پاؤں پر اپنا پاؤں رکھ دینا۔ دیوار پر اس نے بی بی فاطمہ

MashalBooks.com

کے ہاتھ کی شبیہ کو لٹکے ہوئے دیکھا۔

شادی کا روایتی لباس زیب تن کئے ہارون کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا سر ڈھکا ہوا تھا اور ہاتھ مشکل سے دکھائی دیتے تھے۔ دو دوستوں، صلاح اور محمود کے ساتھ وہ اس راستے سے کمرے کی طرف آیا جس سے ابھی چند لمحے پہلے اس کا باپ شاہانہ انداز میں گزرا تھا۔ ہارون سگریٹ پی رہا تھا۔ صلاح نے وہسکی کی ایک بوتل نکال کر ہارون کو تھوڑی سی پیش کی جو اس نے قدرے ہچکچاہٹ کے بعد غٹا غٹ پی لی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ روشنیاں گل کی جا چکی تھیں۔ دو ایک دروازے البتہ آدھے کھلے تھے جن سے عورتوں کی آنکھیں اندر جھانکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ پھر دروازے تیزی سے بند ہوئے اور دونوں دوستوں کو حیرت میں ڈوبا چھوڑ کر ہارون اندرونی صحن کی طرف مڑا۔ گھبراہٹ اور تذبذب کے عالم میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ دوست بے حس و حرکت کھڑے اس کا انتظار کرتے رہے۔

مطلع صاف تھا۔ ستارے چمک رہے تھے۔ دور سے کسی جہاز کی روشنی پہنچ رہی تھی۔ ہارون نے اچانک سگریٹ پھینک کر اسے اپنے پاؤں سے مسلا اور فائزہ کی طرف قدم اٹھانے لگا جو اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ دوستوں نے پیار سے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔

ایک لمحے کے لیے رک کر ہارون نے دلہن کو دیکھا۔ فائزہ فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور اندر آنے والے مرد، اپنے شوہر کو دیکھ کر نظریں جھکا لیں۔ اس نے اس کی بس ایک جھلک ہی دیکھی تھی۔

گھبراہٹ آمیز آہستگی اور بے ڈھنگے پن سے ہارون دلہن کی طرف بڑھا۔ عورتوں کی طرف سے ہنسنے گانے اور ہاؤ ہو کی آوازیں تیز ہو گئیں۔ سب کا جوش بڑھ گیا تھا۔ بے صبری سے عورتیں ملاپ کی رسم کی تکمیل کا انتظار کر رہی تھیں۔ مردخانے میں اگرچہ بے تابی اس قدر نہ تھی لیکن تخیل میں آگ سی ضرور بھڑک اٹھی تھی۔ سب اپنے بھولے بسرے دنوں کو یاد کر رہے تھے۔

ہارون نے فائزہ کو اپنی بانہوں میں لینا چاہا تو وہ تڑپ کر پیچھے ہٹی۔ ہارون اس غیر متوقع ردعمل کے بعد نیچے بیٹھ گیا اور چھوٹی میز سے چائے دانی اٹھا کر دو کپ بھرے۔ ایک کپ اس نے فائزہ کو دے دیا۔ اس نے کپ لے کر شکریہ ادا کیا لیکن چائے نہ پی۔

MashalBooks.com

اپنے تناؤ پر قابو پانے کی خواہش میں ہارون چائے پیتا رہا۔ اس لڑکی سے تو وہ ڈر ہی گیا تھا۔ ہارون کے لئے وہ پرکشش تھی نہ ہی محبوب۔ لیکن اس کلی کو پھول بنانا بھی ضروری تھا کہ باہر لوگ اسی بات کے منتظر تھے۔

جس قدر زیادہ وہ سوچتا کہ اسے کیا کرنا چاہیے، اسی قدر اسے اس صورت حال میں اپنی موجودگی پر جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی۔ ہاں وہ فائزہ، اپنی دلہن کے ساتھ زبردستی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا جو اس کی خواہش سے بے خبر اور بے نیاز تھی لیکن جلدی سے منزل طے کرنا بھی ضروری تھا کہ باہر لوگ اس بات کے منتظر تھے۔

فائزہ نے چائے سے ہونٹ تر کیے اور کپ یوں نیچے رکھ دیا جیسے وہ شوہر کی ہر بات مان رہی ہو۔ وہ پلنگ کے کنارے بیٹھی تھی۔ ہارون نے کھڑکی بند کی تو ساتھ ہی باہر سے آنے والا شور بھی بند ہو گیا۔ اس خاموشی میں وہ فائزہ کے قریب آیا۔ وہ نگاہیں نیچی کیے کانپ رہی تھی لیکن خاموش رہی۔ لازم ہے کہ تم اپنے شوہر کی فرمانبردار رہو۔ وہی کرو جو وہ چاہے لیکن اگر تم نہیں چاہتیں کہ وہ تم پر راج کرے۔ ماں کا مشورہ۔ واحد مشورہ جو اسے دیا گیا تھا۔ یاد آتے ہی اس نے بے ہنگم انداز میں اپنا پاؤں ہارون کے پاؤں پر رکھنے کی کوشش کی۔ اس اجنبی سے۔ اپنے شوہر سے۔ خود کو بچانے کے لیے وہ یہی کچھ کر سکتی تھی۔ پہلی بار اس نے کسی مرد کا لمس محسوس کیا تھا۔ پیچھے ہٹنے کی کوشش میں اس نے جسم اکڑایا، ہاتھ پاؤں مارے۔ لیکن معاملہ اب آگے بڑھ چکا تھا۔ وہ ہارون کی بھرپور گرفت میں تھی۔

''ڈرو نہیں فائزہ۔ تم میری بیوی ہو۔''

فائزہ نے دوبارہ اس مرد کے بھاری جسم سے بچ نکلنے کی کوشش کی۔ لیکن ہارون اس پر حاوی تھا۔ پھر فائزہ نے چیخ ماری اور کراہنے لگی، درد اور بے بسی کے کرب ناک احساس نے اسے نڈھال کر دیا۔

باہر والوں نے چیخ کی آواز سن لی تھی۔ اب وہ خوشی سے والہانہ ناچنے لگے تھے۔

مردانے میں بعض اچھے نشانچیوں نے بندوقیں داغ کر شادی کے کامیاب ہونے کا گویا اعلان کیا۔

سب لوگ خوشی سے دیوانے ہو رہے تھے۔ فائزہ سسکیاں بھر رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے نفرت کا جذبہ محسوس کیا۔ ہارون اس کی چیخ و پکار سے چڑ سا گیا تھا پھر

بھی اس نے پیار سے فائزہ کا نائٹ گاؤن اتارا۔ باہر لوگ اس کو دیکھنے کے منتظر تھے۔ چند لمحوں کے لیے ہارون کو ترس بھی آیا۔ فائزہ پر جو اس کی بیوی تھی، خوبصورت اور پرکشش تھی۔ وہ ایسی عورت تو نہ تھی جسے وہ خود اپنی رضامندی سے منتخب کرتا۔ ہاں اگر وہ بیس سال کی عمر میں اسے دیکھتا تو اور بات تھی۔ لیکن اب۔

تیزی سے باہر نکل کر اس نے نائٹ گون عورتوں کی طرف اچھال دیا۔ صدیوں سے یہی رسم چلی آ رہی تھی۔ خون کی قربانی؟ عورتوں نے جھپٹ کر اسے پکڑا تو گویا ان کی خوشی دوبالا ہوگئی۔ خون آلود نائٹ گاؤن انہوں نے اپنے سروں کے اوپر لہرایا اور خوشی کی شدت سے ناچنے لگیں۔

دوستوں نے بڑھ کر ہارون کو مبارک باد دی۔ خوشی سے گلے لگایا۔ مگر وہ تو کہیں اور کھویا ہوا تھا۔ اس کا جی یہی چاہتا تھا کہ وہ کسی طرح اس ہنگامے سے نکل جائے۔ دروازے کے باہر محمود اور صلاح اس کی راہ دیکھ رہے تھے۔

''کیا خیال ہے کچھ پینے چلیں؟''

''ہاں چلیں۔ کہیں نہ کہیں سے مل ہی جائے گی۔ کوئی موٹر تو ہوگی؟''

لگا تھا کہ انہوں نے ہارون کے من کی بات جان لی ہے۔

کنوارپن کے لٹنے کا رقص عورتوں کی جانب ابھی جاری تھا۔ بلکہ یوں کہیے کہ یہ رقص اب زیادہ جنون آمیز اور قدرے وحشیانہ ہوگیا تھا۔ رقص کی تیز لے بھولے بسرے زمانوں کی یاد دلاتی معلوم ہو رہی تھی۔

ثمینہ پریشانی کے عالم میں ایک کونے میں بیٹھی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ خون سے لتھڑے نائٹ گون کی نمائش سے اسے کراہت ہونے لگی تھی۔ جب برداشت کی ہمت نہ رہی تو وہ باہر نکل گئی۔

رقص کی لے تیز ہو رہی تھی۔

مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے احمد نے بیٹے کو باہر نکلتے دیکھا۔ اداسی اور الجھن کے لمحوں میں وہ یہی کیا کرتا تھا۔ احمد بیٹے پر نازاں تھا اور اس کا شکر گزار بھی۔ لیکن سب سے زیادہ وہ خدا کا ممنون تھا۔ خوب اے بیٹا! بہت خوب! تعریف ہو خدا کی۔ اس نے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کو سگریٹ دیے اور خود بھی خوشی خوشی پینے لگا۔ قریب بیٹھے ہوئے

فائزہ کے باپ کے جذبات بھی یہی تھے۔ چند لمحوں کے لیے اس نے جوش وخروش کے ساتھ اپنی شادی کی پہلی رات کو یاد کیا۔ اسے یاد آیا کہ وہ اس قدر بے قابو ہو گیا تھا کہ ایک اذیت ناک حد تک وہ نامرد رہا اور دروازے کے باہر بے تابی بڑھ رہی تھی۔ اس بھولی بسری یاد پر وہ مسکرانے لگا۔ پھر اسے وہ دن، مسرت انگیز دن یاد آیا جب اس نے اور احمد نے اپنے بچوں کی شادی کا قطعی فیصلہ کیا تھا۔

''عائشہ نے بیٹے کے لیے خوب رشتہ ڈھونڈا ہے۔''

''ہماری بیٹی بھولی بھالی اور خوبصورت ہے۔ اس نے کبھی ہمیں پریشان نہیں کیا۔ ہم نے جو پیسے تم سے مانگے وہ صرف بچوں کی ضرورت کی اشیا خریدنے کے لیے ہیں۔ ہمارے زمانے میں تو اس قدر رقم سے شہزادوں کی شادی ہو سکتی تھی۔ خیر اب مہنگائی بھی تو بے حساب ہے۔ دیکھو بھئی ہم سیدھے سادے لوگ ہیں۔ لیکن شادی آخر شادی ہوتی ہے۔''

''میرے لیے رقم بہت زیادہ تھی۔ لیکن باپ کو مرنے سے پہلے بیٹے کی شادی کی خوشی تو دیکھنی چاہیے۔ بے صبری سے میں اس دن کا انتظار کر تا رہا ہوں۔''

''شادی تو بہت بڑا مسئلہ ہے۔ تمہارے بیٹے نے انتظار کر کے اچھا ہی کیا ہے۔ خدا بخشے میرا باپ کہا کرتا تھا کہ تمہاری شادی کا چرچا سو برس تک رہنا چاہیے۔''

فائزہ کافی بنا کر دے رہی تھی اور مرد ہنس رہے تھے۔ اسے خبر بھی نہ تھی کہ ابھی ابھی باپ نے اس کی زندگی کا فیصلہ کر دیا ہے۔ اس بے خبری کے ساتھ وہ خاموشی سے اندر چلی گئی۔

''تمہارے بیٹے نے دنیا دیکھی ہے۔ میری بیٹی کے لیے وہ اچھا شوہر ثابت ہوگا۔''

''اب اسے واپس آ کر ہمارے ساتھ رہنا چاہیے! پردیس جانے میں کوئی برائی نہیں۔ مگر واپس تو آنا چاہیے تمہاری بیٹی خوبصورت ہے اور تم نے اس کی پرورش بھی خوب کی ہے۔ وہ ضرور اس کے پاؤں کی زنجیر بن جائے گی۔''

شادی کا معاملہ طے ہو چکا تھا۔ ہر بات سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ہوئی تھی۔ بچوں نے ان کا فیصلہ قبول کر لیا۔ آج کافی پیتے ہوئے وہ اپنی کامیابی کی خوشی کا مزہ بھی لے رہے تھے۔ یہ لمحہ زندگی کے ان یادگار لمحوں میں سے ایک تھا جب انسان نہ صرف اپنی ذات سے بلکہ تمام جاندار اور بے جان اشیا سے ہم آہنگی محسوس کرتا ہے۔ ایسے لمحے سورج کی طرح سکون بخش ہوا کرتے ہیں۔

MashalBooks.com

فائزہ نے شادی کا گاؤن پہنا اور پلنگ کے کنارے بیٹھ گئی۔ وہ بجھی بجھی سی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ نہ کچھ دیکھ رہی ہے نہ کچھ سن رہی ہے۔ جیسے برسوں سے بیمار ہو۔ پلنگ کے پاس خون سے لتھڑا ہوا نائٹ گاؤن پڑا تھا۔ فائزہ نے ایک نظر اسے دیکھا۔ اسے متلی سی محسوس ہوئی اور اس نے نظریں دوسری طرف کر لیں۔ عورتیں اب بھی ویسے ہی شور مچا رہی تھیں جیسے وہ اس قسم کے موقعوں پر عموماً مچایا کرتی ہیں۔ حمیرہ نے پیار سے بیٹے کو چوما اور نائٹ گاؤن کو یوں اٹھایا جیسے وہ بڑی قیمتی شے ہو۔ وہ گاؤن کو تعریفی نظروں سے دیکھنے لگی۔ ہاں دیکھا تم نے میری بیٹی کنواری تھی۔ اس نے ہماری لاج رکھ لی۔ عائشہ بھی مطمئن تھی۔ اس نے اپنی بہو کے رخسار پر تھپکی دی۔ بہو اس کی پسند کے مطابق تھی۔ سادہ اور کم گو۔

بے حس فائزہ نے اپنے آپ کو ان عورتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ پھر اسے مبارک باد اور دعائیں دینے والی ان عورتوں کے لیے مسکرانا بھی پڑا۔

''خدا کرے تم لمبی اور خوشیوں بھری زندگی پاؤ۔''

''خدا تمہیں خوبصورت بچے دے۔''

''سدا خوش رہو میری جان۔''

''تمہارا رنگ کیوں اڑا ہوا ہے؟''

''کوئی بات نہیں۔'' عائشہ نے جلدی سے کہا ''بالکل ٹھیک ٹھاک ہے! بس ذرا زیادہ ہی خوش ہے۔''

عورتیں ہنسنے لگیں۔

ان باتوں سے بے نیاز فائزہ اس جنجال سے نکلنے اور سب سے دور بھاگنے کی خواہش محسوس کر رہی تھی۔ لیکن اس کے پاؤں میں ہزاروں غیر مرئی زنجیریں پڑی تھیں جنہیں توڑنا اس کے بس میں نہ تھا۔ اس کے ذہن میں حالیہ واقعات گردش کرنے لگے اور باندھے جانے کے شاید احساس سے اس کا جی متلانے لگا۔ اس کے گلے سے یوں چیخ ابھری جیسے اسے سختی سے دبایا جا رہا ہو۔ اس کا سانس پھولنے لگا۔

''جان من تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔''

اس نے مضبوطی سے ماں کا بازو پکڑ لیا۔

''میری جان۔ میری جان۔''

MashalBooks.com

جلدی سے ایک عورت نے دلہن کے منہ پر تازہ پانی کے چھینٹے مارے۔ آہ۔ یہ بچے۔ کتنے نازک ہیں یہ۔ کتنی نازبرداری ہوتی ہے ان کی۔ اور اب، ہمارے زمانے میں۔ والدین کے جانے کا لمحہ آ گیا۔

جدائی کے احساس سے سہمی ہوئی حمیرہ نے بیٹی کو حوصلہ دیا:

''میری شہزادی۔ ہم پھر تمہیں ملنے آئیں گے۔ نئے گھر میں تم بہت خوش رہو گی۔ دیکھو اب تم لڑکی نہیں ہو۔ عورت بن گئی ہو۔ ثمینہ تمہارا خیال رکھے گی۔ واقعی تم بڑی خوش قسمت ہو کہ ایسی نند ملی ہے۔''

ہزار جتن سے حمیرہ نے اپنے منہ زور جذبوں کو قابو میں رکھا اور آنسو روکنے کے لیے باتیں کرنے لگی۔ فائزہ رو رہی تھی۔ قدیر نے بازو کے پیار بھرے جھٹکے سے اپنی بیوی کو اس سے جدا کیا۔

''آؤ۔ آؤ۔ کہیں دونوں مل کر رونا نہ شروع کر دینا۔ آج تو بڑا مبارک دن ہے۔ لگتا ہے جیسے ہم چاند کی طرف جا رہے ہوں۔''

پھر وہ ہنس دیا۔ عائشہ سے صبر کا دامن چھوٹ رہا تھا۔ بہو کے آنسوؤں پر اسے غصہ آ رہا تھا۔ کتنی بے ہمت ہے۔ اس نے معاملہ نمٹانے کی کوشش کی۔ فائزہ کے رخسار پر تھپکی دیتے ہوئے کہنے لگی۔

''دیکھو دیکھو تم آج سے عورت ہو۔ اب ذرا حوصلہ کرو۔''

حمیرہ نے جاتے جاتے سرگوشی میں التجا کی ''ذرا اس کا خیال رکھنا۔''

مردوں نے ہاتھ ملائے۔ دائیں ہاتھ سینے پر رکھ کر ایک دوسرے کا شکریہ ادا کیا اور پھر ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ فائزہ اب بھی یوں بے حس و حرکت تھی جیسے اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئی ہوں۔

دروازے کے باہر قدیر کو روک کر حمیرہ کہنے لگی:

''سنو ہماری بیٹی خوش نہیں لگتی۔ کھاتی ہے نہ پیتی ہے۔ نہ ہی اسکے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ بس روئے جا رہی ہے۔ ہم سے غلطی تو نہیں ہو گئی۔''

''کیا کہتی ہو پاگل۔ ماں باپ سے جدائی آسان نہیں ہوتی۔ ہمارے ساتھ وہ خوش تھی۔ لیکن ہر شے کا وقت ہوتا ہے۔ زندگی کا چلن یہی ہے۔ وہ نئے ماحول کی عادی ہو

جائے گی۔ اب وہ عورت ہے۔ پھر ہم نے سب کچھ اس کی خوشی کی خاطر ہی تو کیا ہے۔ تم اب رونا چھوڑو۔ ذرا ہنسو۔''

''آہ! ہنسی۔ ہاں ہونٹوں پر ہنسی آ سکتی ہے۔ گھاؤ تو دل پر لگا ہے۔ وہی اس کا دکھ جانتا ہے۔''

''چلو چلو۔''

قدیر بیوی کو لے کر روانہ ہو گیا۔

''ہم اس سے ملنے کے لیے آتے رہیں گے۔''

نہیں بی بی۔ جب تک وہ اپنے نئے گھر سے دل نہیں لگا تی ہم اس سے ملنے کو نہیں آئیں گے۔ یہی بات اس کے لیے بہتر ہے۔''

بیڈ روم میں عائشہ اپنی بہو کے بالوں کو سہلا رہی تھی۔ اس نے ایک لٹ کو سیدھا کر کے دیکھا اور پھر ہاتھ سے پرے کر دیا۔

''میں تمہارا تعارف خاندان کے مردوں سے کرانے لگی ہوں۔ شوہر کی عزت کے لیے تمہیں مسکراتے رہنا ہو گا۔''

مرد کافی سے دل بہلا رہے تھے۔ ثمینہ ان کی خدمت میں مصروف تھی۔ اس نے فائزہ کو ماں کے ساتھ اندر آتے دیکھا تو مسکرائی اور ٹرے لے کر باہر نکل گئی۔ ہارون اپنے باپ اور چچوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی جمال چند عزیزوں اور ہمسایوں سے باتیں کر رہا تھا۔ ہنستے کھیلتے وارتمبا کو نوشی کرتے ہوئے مردوں نے دونوں کو اندر آتے دیکھا۔ عائشہ نے اپنی بہو کا تعارف کرایا۔

''منظور! یہ فائزہ ہے۔ میرے سب سے بڑے بیٹے کی دلہن۔''

''خدا اس پر مہربان ہو۔''

یہ سلسلہ جاری رہا۔

سر جھکائے فائزہ نے خاندان کے مردوں کو اسے گلے لگانے دیا۔ جمال کے سوا کسی نے اسے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ جمال کی نظریں کشش اور بے باکی کے ساتھ بھابھی کا پیچھا کر رہی تھیں۔ ان بے تکلف اور دوستانہ نظروں کا سامنا کرنے کے بعد فائزہ اپنے شوہر کے پاس چلی گئی جو اسے دیکھ نہیں رہا تھا۔

MashalBooks.com

عائشہ کے کہنے کے مطابق فائزہ کمرے میں اکیلی بیٹھی اپنے شوہر کا انتظار کر رہی تھی۔ ناگوار اور بے معنی انتظار۔ وہ اسے اندر آتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ گزشتہ رات کے ان لمحات نے اس کے دل میں نفرت سی پیدا کر دی تھی۔ پھر بھی اسے زیادہ جاننے کی آرزو اندر ہی اندر مچل رہی تھی۔

اب وہ زندگی بھر کے لیے میاں بیوی بن چکے تھے۔ فائزہ نہ تو اس وقت اپنی زندگی کو سمجھنے کے قابل تھی نہ ہی تخیل کی نظروں سے آنے والے دنوں کو دیکھ سکتی تھی۔ لیکن ایک بات طے شدہ تھی۔ وہ دکھی نہیں رہنا چاہتی تھی۔ وہ خوشی میں یقین رکھتی تھی اور اپنے حصے کی خوشیاں سمیٹنا چاہتی تھی۔ وہ یہ ماننے پر تیار نہ تھی کہ شوہر اس کی آرزوؤں پر دھیان نہ دے گا اور اس کی اپنی ماں سے مختلف زندگی بسر کرنے کی ضرورت کو تسلیم نہیں کرے گا۔ وہ بستر پر لیٹ گئی۔ بازو جسم کے ساتھ لگے تھے، اس جسم کے ساتھ جو اس کے لیے اب بالکل بدل گیا تھا۔ کمرے سے آشنائی کے لیے اس نے اپنے گرد و پیش دیکھا۔ یہ اس کا کمرہ تھا۔ ان کا کمرہ۔ اس کی نئی کائنات۔ دیوار پر ایک تصویر لٹک رہی تھی جسے وہ خود کبھی نہ منتخب کرتی۔ تصویر میں سرخ اور سبز جیسے متصادم رنگوں میں ترک عورتوں کو گاؤں میں نہاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ ان کی نظریں بجھی بجھی سی تھیں۔ اس نے سوچا کہ شوہر سے اسے اتارنے کو کہے گی۔ بستر کے ساتھ فرش پر بھیڑ کی کھال کے دو نمدے پڑے تھے اور پیتل کی بڑی ٹرے والا ایک سٹینڈ رکھا تھا۔ اس کمرے میں کوئی شے بھی اس کی نہ تھی۔ حتیٰ کہ لکڑی کے ہلکے رنگ کی الماری میں سلیقے سے پڑی ہوئی اشیا بھی اس کی نہ تھیں۔ جو ہارون کے گھر والوں نے دی تھی۔ اس نے ابھی ان اشیا کو اپنایا ہی نہ تھا اور ساری بات تو اپنانے کی ہوتی ہے۔ وہ اس نئے گھر میں کوئی شے اپنانے کے موڈ میں نہ تھی جس میں اب

MashalBooks.com

اس نے ساری زندگی گزارنی تھی۔

ساتھ والے بڑے کمرے میں گھر کے سب لوگ بیٹھے ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے۔ فائزہ نے کاؤبوائے فلم میں چلنے والی گولیوں کی آوازسنی اور پھر۔

''ہم وقت پر ٹی وی چالو کر کے پوری فلم تو دیکھ سکتے تھے۔''

''ان امریکی فلموں میں ہوتا ہی کیا ہے۔ بس لڑائی مار کٹائی!'' احمد نے کہا۔

ان کا پانچ سالہ چھوٹا بھائی علی بھی باپ کی گود میں بیٹھا فلم میں دلچسپی لے رہا تھا اور ناک میں انگلی بھی پھیرتا جارہا تھا:

''یہ شیرف کیوں مر گیا؟''

جمال نے علی کی انگلی ناک سے نکالی اور ہنستے ہوئے کہنے لگا:

''وہ شیرف نہیں تھا گونگے بندر، وہ تو ڈاکو تھا۔''

''میں گونگا بندر نہیں ہوں۔''

فائزہ مسکرادی۔ علی کی باتوں نے اسے اپنا چھوٹا بھائی یاد دلایا تھا۔ اس نے جلدی سے خاندان کی یادیں ذہن سے جھٹک دیں۔ وہ ہارون کے متعلق سوچنے لگی۔ محبت کے بغیر وہ ایک ساتھ کیسے جی سکیں گے؟ دوستی کے بغیر؟ وہ ایک دوسرے سے باتیں ہی کیسے کرسکیں گے؟ وہ کون ہے؟ زندگی سے کیا چاہتا ہے؟ کیا انھیں ہمیشہ یہاں اس کے والدین کے پاس رہنا پڑے گا؟ دوسرے ملکوں میں اور کبھی کبھار یہاں بھی لوگ محبت کی خاطر شادی کرتے ہیں۔ پھر وہ مل کر زندگی سنوارتے ہیں۔ دوسرے ملکوں میں اور کبھی کبھار یہاں بھی ایسی آزاد عورتیں ہوتی ہیں جو اپنی مرضی پر چلتی ہیں۔ وہ اپنے مقدر کو متاثر کرنے والے طریقوں پر غور کرنے لگی۔ ان سب میں ہارون شامل تھا۔

فلم کسی حیرت انگیز بات کے بغیر ہی ختم ہوگئی۔ اچھے لڑکے کامیاب رہے تھے اور برے کسی مغربی شاہراہ پر مارے گئے تھے۔ ایک دوسرے کو چاہنے والے ہیرو اور ہیروئن اپنی محبت میں زندہ رہنے کے لیے تمام رکاوٹوں پر قابو پا چکے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کا طویل بوسہ لیا۔

احمد کو عوامی جذبات بھڑکھانے والے یہ طویل بوسے نہ بھاتے تھے۔ اس نے بےزاری سے کہا:

''ہمارے ملک میں ایسی فلمیں نہیں دکھائی جانی چاہئیں۔''

وہ اس بات پر خوش ضرور تھا کہ فلم میں اچھے کردار، برے کرداروں پر غالب آ گئے تھے۔اس سے اس کی انصاف پرست طبیعت کو تسلی حاصل ہوئی تھی لیکن عشقیہ داستانوں سے اسے کوئی لگاؤ نہ تھا۔علی کے ریشم جیسے بالوں کو تھپکتے ہوئے کہنے لگا:

''اس قسم کی کہانیاں ہمارے نوجوانوں کو ہمارے طرز زندگی سے بیگانہ کردیتی ہیں۔''

عائشہ نے اتفاق کیا اور خوش بھی ہوئی۔اس کا بس چلتا تو بچے ایسی فلمیں نہ دیکھ سکتے۔کم از کم عائشہ کا دعویٰ یہی تھا۔

جمال ان باتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔اسے بخوبی علم تھا کہ باپ فلم پر مسلسل نکتہ چینی کرتا جائے گا لیکن اس کے ساتھ ساتھ شام کو ٹی وی بھی ضرور دیکھتا تھا۔جہاں تک ماں کا تعلق ہے، اس کا خیال تھا کہ وہ اپنے زبانی دعووں کے باوجود دوسری جگہوں کے مناظر دلچسپی سے دیکھتی ہے۔

اناؤنسر اب زرعی اصلاح کے بارے میں کوئی اطلاع دے رہا تھا۔عائشہ چائے کے برتن سمیٹنے لگی۔

''آج کی رات یہی کافی ہے۔چلو سونے کی تیاری کرو۔''

احمد اب بھی ٹی وی دیکھ رہا تھا۔یہ گاؤں کتنا خوبصورت ہے مگر خدا جانے ان نئے دیہاتوں میں کسان کس قدر خوش ہیں۔میرا باپ زندہ ہوتا تو کیا وہ انہیں پسند کرتا۔ان امداد باہمی کے منصوبوں کو؟ وہ کس قدر خود مختار تھا۔یہ گھر تو ایک دوسرے کے اوپر چڑھے ہوئے ہیں۔''

جمال نے پہلے باپ کو اور پھر ٹی وی کو دیکھا۔''ان گھروں میں پانی ہے اور بجلی بھی۔اور یہ بڑی بات ہے۔''

''ہے تو سہی، لیکن کافی نہیں۔یہ ایک دوسرے کے اوپر چڑھے ہوئے ہیں بیٹا۔ان گھروں میں تم جو بھی کرو گے ہمسایوں کو خبر ہو جائے گی۔اپنی خلوت کا خیال تو رکھنا چاہیے۔تم ابھی چھوٹے ہو۔ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔ہاں بڑے ہو کر سمجھو گے۔''

''شہروں میں تو ایسے ہی ہوتا ہے۔اور یہاں تھوڑے فاصلے پر بھی ہم اپنے ہمسایوں سے زیادہ دور نہیں ہیں۔''

MashalBooks.com

''اس کے باوجود ہم روز بروز انفرادیت پرست ہوتے جا رہے ہیں۔تم اس بات کی وضاحت کیسے کرو گے؟''

''بہت سے کسان کہتے ہیں کہ وہ خوش ہیں اور خوشحال بھی۔خیر کسی ایک مالک سے استحصال کروانے اور اس کے رحم و کرم پر جینے سے تو بہتر یہی ہے۔نہیں؟''

''یقیناً۔لیکن بوکلفا میں رہنے والا ہمارا کزن مطمئن دکھائی نہیں دیتا! بیٹا تمہیں یہ جاننا ہوگا کہ انسان کب مطمئن ہوتا ہے اور کب نہیں ہوتا۔محض یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ وہ مطمئن ہیں یا نہیں ہیں۔ایسے لوگ بھی ہیں جو جب تک چوری نہ کریں مطمئن نہیں ہوتے۔ دوسروں کو رنج ہے کہ وہ اپنی مرضی کا کام منتخب کرنے کی آزادی سے محروم ہیں۔کچھ ایسے ہیں جن کو بے روزگاری نے تنگ کر رکھا ہے۔دیکھو نا، سب ایک بات ہی تو نہیں ہے۔''

''ابو شیرف کہاں ہے؟''

''بیٹا وہ سو گیا ہے۔تمہیں پتہ ہے کہ شیرف بھی سو جاتے ہیں۔''

احمد ہنسا اور چھوٹے بیٹے علی کو پیار کرنے لگا جو پورے اعتماد کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔پھر وہ اٹھا اور بچے کو بستر کی طرف لے گیا۔

عائشہ بڑے کمرے میں جمال کے پاس سے گزری۔

''تم نے بھائی کو دیکھا ہے؟''

''ابو نے اسے بستر پر لٹا دیا ہے۔''

''میں علی کی بات نہیں کر رہی۔ہارون کا پوچھ رہی ہوں۔''

''وہ اپنے کمرے میں نہیں؟''

''نہیں۔''

''پھر وہ باہر نکلا ہوگا۔''

''گستاخ! ماں سے اس طرح بات کرتے ہیں۔''

عائشہ غصے میں آ گئی۔وہ ان بچوں کو ملامت کرنے لگی جو کسی کا بالکل احترام ہی نہیں کرتے۔جمال مسکرایا اور چپکے سے باہر نکل گیا۔اسے ماں سے محبت تو بے پناہ تھی، لیکن اسے تنگ کرنے میں بھی مزہ آتا تھا۔وہ بیٹھک میں گئی جہاں اس کا شوہر تمبا کو نوشی کرتے ہوئے ریڈیو سن رہا تھا۔ایک لمحے کے لئے وہ ہچکچائی اور پھر اس کے پاس چلی گئی۔

MashalBooks.com

''بیٹا واپس نہیں آیا۔ بیوی کو یوں چھوڑنے سے اسے شرم نہیں آتی۔تم مرد ایسی ہی آزادیوں کا مزہ لیتے ہو۔ میں سمجھتی تھی کہ میرا بیٹا مختلف قسم کا ہوگا۔''

احمد نے سکون سے اسے دیکھا اور مسکرادیا۔

''خیر، ابھی دیر نہیں ہوئی۔عرصے سے وہ دوستوں سے نہیں ملا تھا۔ بہت سی باتیں بھی کرنے والی ہوں گی۔ پھر اسے پتہ ہی ہے کہ اسے کیا کرنا ہے۔''

اس کی آنکھوں میں نیند تھی۔سگریٹ پیتے اور ریڈیو سنتے ہوئے اس نے گھڑی دیکھی۔ عائشہ نیچے بیٹھ کر کچھ سینے لگی۔لیکن ابھی تک وہ غصے میں تھی۔ بار بار وہ کلاک کی طرف دیکھتی اور آہ بھرتی۔ بیوی کے جانے پہچانے جملوں اور آہوں سے بچنے کے لیے احمد اٹھا اور ریڈیو بند کر دیا۔ وہ تھکا ہوا بھی تھا۔

''میں سونے جا رہا ہوں۔''

عائشہ نے یوں ظاہر کیا کہ جیسے وہ سن نہ رہی ہو۔ وہ ابھی یہیں رہنا چاہتی تھی۔ ہارون کی واپسی تک۔اوہ مگر وہ کچھ کہے گی نہیں۔بس اس کی طرف دیکھے گی اور وہ اس کی نظروں کا مفہوم خود ہی سمجھ جائے گا۔

عائشہ کے ارادوں کو بھانپتے ہوئے احمد مڑا۔

''آؤ چلیں۔''

عائشہ نے قدرے تامل کیا پھر سینے پرونے کا سامان سمیٹ کر آہ بھرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

بیڈروم میں فائزہ پلنگ کے ایک طرف سمٹ کر پورے لباس میں سوگئی تھی۔اب وہ خواب دیکھ رہی تھی۔شادی کا لباس زیب تن کیے وہ گلی میں گھوم رہی تھی۔ جہاں دھندلی سی روشنی تھی اور بڑے بڑے درختوں سے پرندے اڑ رہے تھے۔خون آلود گاؤن پہنے ایک عورت اس کی طرف آئی۔ فائزہ اپنے ہی سائے سے دبک گئی۔اتنے میں ہارون بھی خون آلود دھبوں والا چغا پہنے اس کی طرف بڑھا لیکن اسے دیکھے بغیر آگے گزر گیا۔ بہت سے چہروں نے اس پر حملہ کر دیا۔ان کی آوازیں کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھیں۔ پھر خاموشی۔ مارڈالنے والی خاموشی۔ فائزہ آگے چلتی گئی۔اس کا لباس تار تار ہو چکا تھا۔اس نے چیخ ماری اور چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔خوف کے عالم میں

اس نے چاروں طرف دیکھا۔ اسے خبر نہ تھی کہ وہ کہاں ہے۔ اس کی حالت ایسی ہی تھی جیسے کوئی بچہ ڈراؤنے خواب سے جاگ اٹھا ہو۔ خواب کے وہموں میں گم، اپنی چھاتیوں سے ایک گدے کو چمٹا کر اس نے پہلو بدلا۔

ہارون اور اس کے دوست کھچا کھچ بھری ہوئی ایک بار میں بیٹھے بیئر پی رہے تھے۔ ریڈیو سے ام کلثوم کی گہری، موہنی اور مضبوط آواز سنائی دے رہی تھی۔ لگتا تھا کہ ہارون اس کے دوست آواز کے سحر میں کھو گئے ہیں۔ انہوں نے خوب پی تھی، خوب باتیں کی تھیں اور اب خاموش ہو چکے تھے۔

کافی کے کپ یا بیئر کے گلاس سامنے رکھے مرد یوں بیٹھے تھے جیسے وہ نہ کچھ سن رہے ہوں نہ کچھ دیکھ رہے ہوں۔ صلاح اس روز کے اپنے محبوب موضوع، فرانس جا کر محنت کرنے، دولت کمانے، بچت کرنے اور پھر شادی کرنے کے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ اس نے دوبارہ ہارون کی طرف رخ کیا اور کہنے لگا:

''اچھا تو فرانس میں ابھی کام مل جاتا ہے۔''

''زیادہ نہیں۔ تمہیں پتہ ہی ہے ہمارے بہت سے بھائی بند اب واپس وطن آ رہے ہیں۔''

''ہاں۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ ابھی ایسے کئی کام ہیں جو فرانسیسی خود نہیں کرنا چاہتے۔''

''ہوں۔ گلیوں میں جھاڑو دینا۔ کوڑا کرکٹ اکٹھا کرنا۔''

''تم پیرس میں کیا کرتے ہو؟''

''میں تو ایک تعمیراتی جگہ پر کام کرتا ہوں۔''

''میرا کزن بلڈوزر چلاتا ہے۔ پہلے وہ کرین چلایا کرتا تھا۔ وہ تو اچھے بھلے پیسے کما لیتا ہے۔''

ہارون نے مزید بیئر کا آرڈر دیا۔

''خیر سب کا یہ حال نہیں ہے۔ فرانس میں مہنگائی بھی بہت زیادہ ہے خصوصاً آج کل تو بہت ہی برا حال ہے۔ رہی رہنے کی جگہ تو تم اندازہ ہی نہں کر سکتے کہ کس قدر مصیبت ہے۔ جھونپڑیاں، گھروندے اور مزدوروں کی گندی بستیاں - اور وہ بھی مہنگی۔ فرانس میرے بھائی جنت نہیں ہے۔ پاگل نہ بنو۔ یار بس میرا ایک دوست ہے وہ دس مربع میٹر کے

ایک کمرے میں پانچ اور مزدوروں کے ساتھ رہتا ہے۔ کیا تم اندازہ کر سکتے ہو؟''

دوستوں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا کیونکہ اس کی آواز میں شدت پیدا ہو گئی تھی۔ بات یہ بھی تھی کہ وہ عام طور پر خاموش رہا کرتا تھا۔

''پھر یہ بھی ہے کہ تم جو مرضی کر لو، چاہے کام کرتے کرتے خود کو نڈھال کر لو، مہذب بن جاؤ پھر بھی کوئی نہ کوئی بدمعاش تمہیں یہ ضرور جتلاتا رہے گا کہ تم پردیسی ہو اور یہ کہ بہتر یہی ہے کہ تم کہیں اور چلے جاؤ۔ یہاں تک کہ بے روزگاری کے ہاتھوں تنگ آ کر جو پہلے خاموش رہتے تھے وہ بھی اب توہین کرنے لگے ہیں۔''

ہارون نے بیئر ختم کر لی۔ دوست توجہ سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''پھر وہاں جاتے کیوں ہو؟ وہاں رہتے کیوں ہو؟''

''بھائی، کہیں نہ کہیں روزی تو کمانی پڑتی ہے۔''

''میں تو غلامی کرنے فرانس نہ جاؤں گا۔''

محمود نے غصے سے کہا تو ہارون کو تعجب ہوا۔

''یہاں یا کہیں اور میرے بھائی - اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''خیر، یہ ایک سی بات بھی نہیں ہے۔''

ہارون نے پیار سے اس کی پیٹھ تھپکی۔

''تمہارا حال ہمارے جیسا ہو تو پھر تم بھی کسی نہ کسی شے کے غلام ہو گے۔ بس ایسے ہی ہوتا ہے! تم کب سے کام تلاش کر رہے ہو۔''

''چار ماہ سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔''

''اچھا، دیکھو تم بے روزگاری کے غلام ہو گئے ہو۔ یہ تو سب سے بری بات ہے کیوں کہ لوگ تمہیں ہی اس کے لیے الزام دیں گے۔ وہ کہیں گے کہ تمہیں کام کرنا ہی نہیں آتا۔ تم سست ہو۔ ہم جو کام فرانس میں کرتے ہیں۔ خدا تمہیں اس سے محفوظ رکھے۔ لیکن یہاں بے روزگاری تو اس سے بھی بری ہے۔''

''میں یہاں اپنے وطن میں رہنا اور کام کرنا چاہتا ہوں۔ میرا باپ کہا کرتا تھا کہ پردیس تو جہنم ہے۔ پورا جہنم۔ وہ اس سے بچتا ہی رہا۔ وہیں اس کا انتقال ہوا۔''

ایک لمحے کے لیے تینوں دوست خاموش ہو گئے۔ پردیس میں محمود کے باپ کی

وفات نے انہیں اداس کر دیا تھا۔ وہ وطن میں بھوک کے ہاتھوں مرنے سے بچنے کے لیے پردیس گیا تھا۔

''میرے بھائی یہ حال بس ہمارا ہی نہیں ہے۔ دنیا بھر کے غریب ترک وطن پر آمادہ رہتے ہیں۔ کاش ایسا نہ ہوتا، لیکن حقیقت یہی ہے۔''

''میرا خیال تھا کہ یہاں کام تلاش کرنا آسان ہے۔ شاید ہمیں زیادہ ہمت سے کام لینا پڑے۔ لیکن یہ ناممکن ہے۔''

''کون ہمیں اس بات سے روکتا ہے؟''

''تم مجھے احمق بنا رہے ہو؟ کام کا آغاز کرنا ہمارے بس کا روگ نہیں۔ تم جانتے ہو اور میں بھی جانتا ہوں کہ یہاں سفارش کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اگر کوئی بااثر شخص تمہارا واقف ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ ورنہ سب کچھ بے کار ہے۔ میرے بھائی تم اس چلن کو بدل نہیں سکتے۔ یہ تو بس یوں ہی رہے گا۔''

''غلامی نے ہمیں اس لعنت میں جکڑا ہے۔ وہی تو اصل بیماری ہے۔''

''شاید۔ لیکن یہ تو ماضی کا قصہ ہے۔ ہم آزادی حاصل کر بھی چکے اب تو جاگنا چاہیے اور دیکھو فرانس تو سامراجیت کا نشانہ نہیں بنا۔ دھکم پیل وہاں بھی ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے۔ یہی کچھ روس اور چین میں ہو رہا ہے۔ اسے بدلنا ہو گا۔ لیکن میں بدلنے کا طریقہ نہیں جانتا۔''

اب صلاح کی باری تھی۔ وہ فکرمند دکھائی دے رہا تھا۔

''میں سمجھتا ہوں تم کس قدر مبالغے سے کام لے رہے ہو۔ آزادی کے بعد سے ہمارے ملک میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں۔ کارخانے قائم ہوئے ہیں۔ ہم اپنے لیے تیل نکال رہے ہیں۔ اصلاحات کے بعد کسانوں کی حالت بہتر ہو گئی ہے۔ میرے بھائی اصل بات یہ ہے کہ ہمارا ملک ترقی پذیر ہے۔ یہ ہے بات۔ ترقی پذیر ملک۔ ہر شے فوراً ہی تو نہیں مل جاتی۔''

ہارون قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

''تم ویسی بات کر رہے ہو جیسی وہ ٹی وی پر کرتے ہیں یا اخباروں میں لکھتے ہیں۔ میرے بھائی زندگی ٹی وی یا اخبار نہیں۔''

''پیرس میں عورتیں کیسی ہوتی ہیں؟'' صلاح نے سنجیدگی سے پوچھا۔ وہ وقتی طور پر فرانس میں کام کا موضوع بدلنا چاہتا تھا تا کہ جب ہارون پرسکون ہو تو وہ اس سے مزید معلومات حاصل کر سکے۔ اپنے ذہن میں وہ تہیہ کر چکا تھا۔ وہ ضرور فرانس جائے گا اور اس قدر دولت کمائے گا کہ بالآخر شادی کر سکے۔ اکیلے رہنا بھی بھلا کوئی زندگی ہے۔ بیوی کے بغیر، بچوں کے بغیر۔ نہیں یہ کوئی زندگی نہیں۔

قدرے خمار کے عالم میں ہارون نے صلاح کے کندھے پر تھپکی دی اور ہنسنے لگا۔

''عورتیں۔ تم پھر خواب دیکھنے لگے ہو؟ مانو نہ مانو وہ مزے اڑانا بھی آسان نہیں ہے۔''

''تم مجھے اس بات کا یقین نہیں دلا سکتے۔''

''ہاں تم تو ان کی بات مانو گے جو تمہیں کہانیاں سنایا کرتے ہیں۔''

''ارے میاں اس طرح کے خواب نہ دیکھو۔ اس طرح کے خواب نہ دیکھو۔ میں بھی کبھی ایسے ہی سپنے دیکھتا تھا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ......''

''تمہاری شادی ہوگئی ہے۔ اب تمہیں کیا پروا۔''

ہارون نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہاں۔ واقعی اب وہ شادی شدہ تھا۔

جس شے کو وہ پوری طاقت سے ذہن سے نکالنا چاہتا تھا، اب وہ پھر سے لوٹ آئی تھی۔ فائزہ کا چہرہ، اس کا رونا، شادی کی رات، اس نے ایک اور بیئر کا آرڈر دیا۔

ویٹر بار میں ایک شرابی گاہک سے نمٹ رہا تھا۔

''تمہیں کہہ چکا ہوں کہ مزید نہیں ملے گی۔''

سرکش گاہک توازن قائم رکھنے کے لیے کاؤنٹر پر جھک گیا تھا۔

''بس بس، صرف ایک۔ صرف ایک اور پھر میں چلا جاؤں گا۔ وعدہ رہا۔''

''ہم بار بند کر رہے ہیں۔ بہرے ہو۔ سنتے نہیں ہو؟''

ویٹر مینجر کو بلا لایا۔ اس پر شرابی چڑ گیا۔ اس نے خالی گلاس بار پر دے مارا اور چیخا:

''یہ کوئی مقدس جگہ تو نہیں ہے۔''

ہارون، اس کے دوست اور بار میں بیٹھے ہوئے سب لوگ اس بات پر ہنسنے لگے۔

''ہم تمہیں بتا چکے ہیں۔'' مینجر نے بازو سے شرابی کو باہر دھکیلتے ہوئے کہا۔

''میں پولیس کے ساتھ کوئی مصیبت مول نہیں لینا چاہتا۔''

شرابی مزاحمت کرنے لگا۔

''اگر تم سمجھتے ہو کہ ابھی وقت نہیں ہوا تو جاؤ حکومت سے شکایت کرو۔ قانون میں تو نہیں بناتا۔ تم کیا چاہتے ہو وہ میری بار بند کرادیں۔ یہ چاہتے ہو؟''

''میں بس بیئر چاہتا ہوں۔ تمہاری بار بند کروانا نہیں چاہتا۔ بس بیئر چاہتا ہوں۔ بس ایک۔ خدا کی لعنت ہو قادر۔ قسم کھاتا ہوں کہ بیئر کے بغیر نہ جاؤں گا۔ سال بھر سے تو یہاں آرہا ہوں۔''

''دس سال بھی ہوتے تو کوئی فرق نہ پڑتا۔ سمجھے۔''

مینجر زبردستی دھکیلتا ہوا شرابی کو دروازے کی طرف لے گیا۔ اس نے خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کی۔ پھر بند دروازے کے پیچھے سے مینجر کو برا بھلا کہنے لگا۔ ''یہ کم بخت پولیس اور حکومت ہی ہیں جو ایماندار شہریوں کو پیاس بجھانے کے لیے بیئر پینے سے روکتی ہیں۔'' مینجر نے سر ہلایا اور ہنسنے لگا۔

''اس کا یہ حال فرانس میں ہوا۔ خیر، بھائیو اب ہم بار بند کرنے لگے ہیں خدا نے چاہا تو کل پھر ملیں گے۔''

اس نے روشنیاں ہلکی کردیں اور گاہک جانے لگے۔ شرابی سڑک پر بدحواس ہو رہا تھا۔

''گھر جا رہے ہو؟'' صلاح نے پوچھا۔ ابھی وہ دوستوں کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ گاہک تتر بتر ہو چکے تھے۔ تینوں دوست گومگو کے عالم میں دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔

''کیا خوبصورت رات ہے۔'' صلاح نے اصرار کیا۔

''کیا سب کچھ بند ہو چکا ہے؟'' ہارون نے پوچھا۔

''ہاں، میرے بھائی یہ پیرس تو نہیں ہے۔''

''تو ساحل کی طرف کیوں نہ چلیں؟''

یہ ہارون کی تجویز تھی۔ محمود اس پر بہت حیران ہوا۔ اس کی بیوی ہوتی تو وہ فوراً گھر کا رخ کرتا۔ یہ ہارون بھی عجیب شے ہے۔ اب انہوں نے پائین کلب ساحل کی طرف رخ کر لیا تھا۔ محمود، ہارون کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ اسے سمجھ نہیں سکا۔ لیکن اس نے

MashalBooks.com

جرات نہ کی۔

''اچھا تو تم فرانس واپس چلے جاؤ گے؟''

''پتہ نہیں۔''

وہ خاموشی سے چلتے رہے۔ ہوا نے ان کا خمار کم کر دیا تھا۔ صلاح نے ہارون کو آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے پر مجبور کر دیا۔

''سچ کہو ہارون بار میں تم جو کچھ کہہ رہے تھے اس کی وجہ نشہ تھا؟''

ہارون مسکرایا۔ سمندر اور افق کی طرف دیکھا۔ ادھ پیا سگریٹ ریت پر پھینکا اور پاؤں سے اسے مسلنے لگا۔

''بھائی سچ بتانا ہی اچھا ہوتا ہے۔ تکلیف دہ سچائی، مزیدار جھوٹ سے بھی بہتر ہوتی ہے اور میں نے سچ ہی بتایا تھا۔''

''میں اس کے باوجود فرانس جانا چاہتا ہوں۔ اگر میں پیرس آیا تو کیا تم میری مدد کرو گے؟''

''یقیناً بھائی۔ یقیناً ہم تمہاری مدد کریں گے۔ لیکن امیدیں اتنی نہ بڑھاؤ۔''

''اگر میں نہ گیا تو کبھی شادی کے لیے پیسے نہ حاصل کر پاؤں گا۔''

''تو شادی نہ کرو۔''

''تم نے خود تو کی ہے۔ نہیں کی؟''

''کون؟ میں؟ مجھے کوئی جلدی نہ تھی۔ بس والدین کی خوشی کی خاطر شادی کی ہے۔''

''لیکن تم خوش نہیں ہو؟''

''میری ایک بات یاد رکھو۔ یہ سوال کبھی خود سے نہ پوچھنا۔ جب تک ہم زندہ ہیں، سکھ اور دکھ تو چلتے ہی رہیں گے۔ بس یہی زندگی ہے۔''

تینوں ریت پر بیٹھ گئے۔ وہ خاموش تھے۔ محمود سمندر کی لہروں کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ چیخا۔

''میں ایسی زندگی نہیں بسر کرنا چاہتا۔''

''یہ تم نے کیسے جانا کہ میں ایسی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں؟''

ہارون کے جواب سے حیران ہو کر محمود نے اسے دیکھا پھر نظریں پھیر لیں۔

اب صلاح کی باری تھی۔ اس نے سوچا کہ آخر تم کیسی زندگی چاہتے ہو۔ لیکن یہ سوال اس کے ہونٹوں تک نہ پہنچ سکا۔ اگر وہ پوچھ ہی لیتا تو ہارون کا جواب کیا ہوتا؟ شاید وہ کہتا ''میں نہیں جانتا۔ کچھ بھی نہیں جانتا۔ بس واقعات ہوتے ہیں۔ میں تو کچھ طے نہیں کرتا۔ شاید اسی کو تقدیر کہتے ہیں۔''

قسمت اور ارادہ مل جاتے تو کیا ہوتا؟ اس سے اسے نکھری ہوئی رات میں سمندر کے کنارے ہونا اچھا لگا۔ اس کے خیال میں یہ خوبصورت ساحل تھا۔ شاید اس علاقے میں سب سے زیادہ خوبصورت جہاں ٹہلنے اور نہانے کے قابل ہونے سے کسی کی زندگی بدل سکتی تھی۔ اس شام اسے سمندر کا گیت ام کلثوم کے نغمے جیسا سندر لگا۔

آخر شب ہارون نے گھر کی راہ لی۔ فائزہ نیند میں کھوئی ہوئی تھی۔ پورے لباس میں سمٹی ہوئی۔ ہارون نے چند لمحوں کے لیے اس کا جائزہ لیا۔

''فائزہ۔''

وہ چونک کر اٹھی اور پلنگ پر بیٹھ گئی اور عجیب سی نظروں سے ہارون کو تکنے لگی۔

''تم سوئی نہیں؟''

''تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ بلا ارادہ ہی آنکھ لگ گئی۔''

ہارون نے نائٹ لیمپ جلایا اور بڑی روشنی گل کر دی۔ پھر وہ کپڑے اتارنے لگا، فائزہ نے اونگھتے ہوئے چادر اوپر لے لی۔ ہارون اس کے ساتھ لیٹ گیا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے فائزہ کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ شراب کی بو اب بھی اس کے منہ سے آ رہی تھی۔ فائزہ کو تعجب ہوا اور غصہ بھی آیا۔ اب وہ اسے زور سے بھینچ رہا تھا۔ اور وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی خواہش شدید اور اچانک تھی۔ فائزہ کو ایک بار پھر اذیت سہنا پڑی۔ وہ چیخی لیکن ہارون کے ہونٹوں نے چیخ جذب کر لی۔ پیار کے سحر نے اسے گرفت میں لے رکھا تھا۔ رگوں کا تناؤ ختم ہوتے ہی اسے بے پناہ مسرت کا احساس ہوا۔ جسم عجیب سے نشے میں تھا۔ اس نے سگریٹ جلایا۔ آہستہ آہستہ پیتے ہوئے وہ خوابوں کی وادی میں کھو گیا۔

فائزہ جاگتی رہی۔ اس کے جاگ جانے کے خوف سے وہ بت بنی ہوئی تھی۔ طرح طرح کے خیالات اور یادیں اس کے ذہن میں آ رہی تھیں۔ اچھا تو یہ ہے میاں

بیوی کی رات؟ وہ اس خیال سے کانپ اٹھی کہ ہارون شراب پیتا ہے۔ اس کے خاندان میں شراب کا مطلب مصیبت اور زوال تھا۔ تنہائی کے بے پایاں احساس سے اس کا سر چکرانے لگا۔ لگتا تھا کہ پلنگ سمندر میں کشتی کی طرح لڑکھڑا رہا ہو۔ اس نے چادر کو زور سے پکڑ لیا۔ چیخ دبانے کے لیے اس نے اپنا سر تکیے کے نیچے چھپالیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے تو تناؤ کم ہوا۔

MashalBooks.com

ہارون اور اس کا باپ دونوں مسجد کی طرف جا رہے تھے۔

''بیٹا میں جانتا ہوں کہ تم آج میری خوشی کی خاطر میرے ساتھ آئے ہو۔ یہ اچھی بات ہے۔لیکن بہتر ہوتا اگر تم نماز کی خاطر آتے۔''

جواب دینے کے بجائے ہارون لوگوں سے بھری ہوئی گلی کو دیکھنے لگا۔ بچے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ پرانے دنوں کی طرح موچی اب بھی جوتے مرمت کر رہا تھا۔ نائی کی دکان پر لوگ انتظار کر رہے تھے۔ ایک ٹی وی مکینک گاہک کو یقین دلا رہا تھا کہ اس کا ٹی وی اب مرمت کے قابل نہیں رہا۔ وہ یہ بات مان نہیں رہا تھا۔ جب وہ بچہ تھا تو ٹی وی مکینک کا کوئی وجود نہیں تھا۔لیکن نائی، قصائی اور موچی بالکل اسی جگہ تھے جہاں کہ وہ اب تھے۔عورتیں سودا سلف خرید رہی تھیں۔لگتا تھا کہ ان تمام لوگوں کو گلی میں ادھر ادھر گشت کرنے، خرید و فروخت کرنے یا باتیں کرنے کے علاوہ کوئی کام نہ تھا۔ اس کوٹھی میں پہلے ایک امیر صاحب رہتا تھا۔ آزادی کے بعد وہ اپنے وطن لوٹ گیا۔ اب اس کی کھڑکیوں میں کپڑے سوکھ رہے تھے اور کھیلتے چیختے بچے اس کے ہر دروازے سے برآمد ہو رہے تھے۔کوٹھی کے سامنے والے حصے کی اچھی طرح دیکھ بھال نہیں کی گئی تھی۔ یہاں تک کہ ایک بڑی دراڑ بھی نمودار ہوگئی تھی جس کی مرمت کی ضرورت تھی۔ چاروں طرف پھول اگے ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ شاندار تھا۔ زندگی سے بھرپور۔ خوشحال نہ سہی، لیکن خوش باش۔ جیتا جاگتا۔ اس لمحے ہارون کا شہر پھر اسے لبھانے لگا۔

''جان پدر۔تم نے فرانس میں اپنا مذہب فراموش تو نہیں کر دیا تھا؟''

''پتہ نہیں۔خدا جانے میں نے کیا کیا فراموش کر دیا تھا۔''

''میں تمہارے لیے، تمہاری بیوی کے لیے اور تمہارے مستقبل کے خاندان کے

لیے دعا کروں گا۔ خدا ہمیں ننھے سے نواسے سے نوازے۔ بیٹا اب میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔ بوڑھا۔''

ہارون نے باپ کی طرف دیکھا۔ وہ توانا اور ہشاش بشاش تھا۔ چند سفید بالوں اور شکنوں کے باوجود جوان دکھائی دیتا تھا۔

''تم بوڑھے تو نہیں لگتے۔''

احمد کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ ابھری۔ وہ اچھی صحت اور مردانگی کے احساس سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب وہ مسجد کے قریب پہنچ رہے تھے۔ اس لیے احمد نے فوراً ہی ان خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا۔

اندر پہلے ہی بہت سے لوگ خشوع وخضوع سے عبادت کر رہے تھے۔ ان کی مدھم آوازیں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ ہارون نے نماز تو ادا کی، لیکن اس کے خیالات کہیں اور پہنچے ہوئے تھے۔ رنگ اسے متوجہ کر رہے تھے۔ ستونوں کے سبز اور گلابی رنگ اور سرامکس کے سرخ، نیلے اور پیلے رنگ۔ اسے رنگ تو ہمیشہ ہی متوجہ کر لیتے تھے۔ آہ۔ پچی کاری کے کام والا ایک گھر بنانا۔ اس کی نگاہیں نقش ونگار کا پیچھا کر رہی تھیں اور اس کا ذہن خلاؤں میں گھوم رہا تھا۔ پیرس۔ پیرس، وہ عظیم اجنبی شہر جس میں روایتوں کو ٹھوکر ماری جا سکتی ہے، ہاں گمنام رہا جا سکتا ہے۔ پیرس۔ چندھیا دینے والا شہر جو کھینچ لیتا ہے۔ ہزاروں قسم کے لوگوں سے بھرا ہوا شہر، پھر بھی ایسی جگہ جہاں تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔ پیرس، وہ واحد مقام جہاں کبھی کبھار اسے آزاد ہونے کا مسحور کن احساس ہوتا تھا۔ کسی اور جگہ اسے اتنی شدت سے یہ احساس کبھی نہ ہوا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے نمازیوں کے چہرے عرب مزدوروں میں بدل گئے۔ اس جیسے مزدور جو ایک ہی علاقے میں، ایک ہی ہوٹل میں رہ رہے تھے۔ گلیوں میں گھومتے اور کارنر بار سے کافی پیتے۔ وہ سامنے جو آدمی سر جھکائے بیٹھا ہے، ہارون کو اس مزدور کی یاد دلانے لگا جسے اس نے کبھی مسکراتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ آج وہ اپنے باپ کے ساتھ مسجد میں بیٹھا تھا۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر دعا آئے مدتیں گزر گئی تھیں۔ یہ بات فطری طور پر ہی ہوئی تھی۔ وہ کوئی خلا محسوس کرتا تھا نہ ہی ضرورت یا اداسی۔ ان لوگوں میں جو عادت یا گہرے ایمان کی بنا پر عبادت کر رہے تھے، اس نے نہ کوئی مایوسی دیکھی اور نہ ہی بے

صبری۔ خود وہ خدا سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ اس کی توجہ کا مرکز انسان تھا اور زندگی۔ جب بھی وہ خود سے سوال کرتا کہ لوگ ایسے کیوں ہیں۔ اچھے برے، منصف اور ظالم، شریف اور بدمعاش۔ تو جواب کی تلاش میں وہ کبھی خدا تک نہیں پہنچتا تھا۔ وہ خود کو انسان کی دنیا میں محدود رکھتا جس میں سوالات تو ان گنت تھے، لیکن جواب بہت کم۔

ہارون ان سپنوں میں کھو گیا۔ کبھی بچپن کی باتیں، کبھی جوانی کی، کبھی شادی کے واقعات اور کبھی فائزہ اور کبھی ان عورتوں کی یادیں ذہن میں مچلنے لگیں جن سے اس کا کوئی تعلق رہا تھا۔ کبھی فرانس میں گزرے ہوئے دنوں کے خیال اس کے تخیل میں ہلچل مچانے لگتے۔ ان کے ذہن میں عجب طور پر بار بار ایک جملہ گونجنے لگا۔

''پتہ نہیں۔ خدا جانے میں نے کیا کیا فراموش کر دیا تھا۔''

اسے سخت تعجب ہوا۔ پھر ان سیخ کبابوں کی یاد اسے آنے لگی جو ماں بڑی مہارت سے بنایا کرتی تھی۔ مزیدار۔ چٹپٹے اور خوشبو والے۔ واپسی پر وہ گوشت اور انجیر خریدیں گے، جو اس کی ماں کو بہت پسند تھیں۔ ارے وہ نعمان، تو نہیں؟ وہ نماز پڑھ رہا تھا یا بس بہانہ ہی کر رہا تھا؟

ہارون کو اندازہ تھا کہ اس کی توجہ منتشر ہو چکی ہے۔ اس نے خیال کیا کہ نعمان کی توجہ بھی ایسے ہی اس کے کاروبار اور سودے بازی کی نذر ہو چکی ہوگی۔ ویسے ہے وہ جلدی جلدی کام کرنے کا ماہر۔ وہ اپنے آپ کو پھنسائے بغیر ہر صورت حال سے فائدہ اٹھانا خوب جانتا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک آرٹ ہے۔

باپ نے خدا کے ساتھ اپنا پرخلوص مکالمہ ختم کر لیا تھا۔ اب وہ باہر کی طرف نکلنے لگا۔ ہارون اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ گلی میں داخل ہوئے جو لوگوں اور بھنے ہوئے گوشت کی خوشبوؤں سے بھری ہوئی تھی۔ بھکاری خیرات مانگ رہے تھے اور راہگیروں کے دامن کھینچ رہے تھے۔ ایک بوڑھے آدمی نے ''اللہ اکبر'' کا نعرہ لگایا اور مشاق ہاتھ پھیلا دیا۔ ہارون نے سوچا اس کا چہرہ زاہدانہ ہے۔ وہ اس پستی کا شکار کیسے ہو گیا ہے۔ پیرس میں کون مانگتا ہے۔ زندگی اور شراب کے مارے ہوئے انسان۔ بازوؤں میں بچے اٹھائے ہوئے جپسی۔ اور یہاں؟ بوڑھے لوگ، خاص طور پر بوڑھے لوگ۔ جن میں سے بعض پرانے بزرگوں جیسے دکھائی دیتے ہیں۔ عورتیں جنھوں نے بوسیدہ نقابوں میں منہ ڈھانپ رکھے

ہوئے ہیں اور بعض اوقات بچے بھی۔ اس نے رحم، جھلاہٹ اور فکرمندی کے ملے جلے جذبات محسوس کیے۔اس قسم کے منظر دیکھ کر وہ ہمیشہ ایسے جذبات محسوس کرتا تھا۔

ایک آدمی اس پرانے کیمرے کے ساتھ تصویریں اتار رہا تھا جو اسے کوڑے پر پڑا ملا تھا۔ ہارون رک کر اسے دیکھنے لگا۔''اچھا تو تم اس کے ساتھ تصویریں اتار سکتے ہو؟'' فوٹوگرافر سمجھا کہ ہارون بھی تصویر اتروانا چاہتا تھا لیکن جب وہ پھر چلنے لگا تو فوٹوگرافر کو یوں لگا جیسے اس کی توہین کی گئی ہو۔

''ٹیپ ریکارڈرز۔ تو تمہیں ٹیپ ریکارڈر نہیں چاہیے؟ ریڈیو۔ بالکل نئے کیمرے؟''

''بیٹا یہاں پھیری والوں کی بھرمار ہے۔ جوان لوگ تو ہر وہ شے چاہتے ہیں جو انہیں نظر آجائے۔ یہ اچھی بات نہیں۔ بالکل اچھی بات نہیں!'' ہارون ہنسنے لگا۔

''جب کرنے کو کافی کام نہ ہو تو پھر ایسی باتوں ہی میں وقت کٹتا ہے۔ پیرس میں ہمارے بہت سے بھائی بند تو......''

''......سڑکوں پر پھیری لگاتے ہیں۔نہیں بیٹا۔ یہاں پہلے ہی ان کی بھرمار ہے۔ پھر کیا پتہ یہ سب چوری کی چیزیں ہی ہوں؟''

ہارون دوبارہ ہنس دیا۔

''دھکم پیل بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسے چوری نہیں کہہ سکتے۔ یہ چیزیں تو ہر جگہ سے آتی ہیں۔ یہاں سے۔ وہاں سے۔ ہر جگہ سے۔اب دیکھو نا یہاں کرنے کو کافی کام نہیں ہے۔ان نوجوانوں کو ہی دیکھو۔ بس وہ یونہی مٹرگشت کر رہے ہیں۔ اگر انہیں کوئی شے بیچنے کو مل جائے تو یہ کسی نعمت سے کم نہیں۔''

''یہ ملک پرانا ہے بیٹا۔لیکن جدید زندگی کے ان تمام شعبوں میں یہ بچے کی طرح نیا ہے جنہوں نے دنیا کو ہلا رکھا ہے۔ جیسے کہتے ہیں نا ہم اتنے 'ترقی یافتہ' نہیں۔کیا خوب بات ہے۔کہ ان تمام نوجوانوں کو کام کہیا کرسکیں۔تو یہ ہے معاملہ۔''

''مجھے بھی کوئی کام نہیں مل سکا ہے۔''

''جانتا ہوں بیٹا، جانتا ہوں۔لیکن مل جائے گا۔تمہیں اچھی نوکری مل جائے گی جس سے تم ندامت کے بغیر اپنے خاندان کو پال سکو۔''

''شاید۔''

دونوں باپ بیٹا گلی کے خوانچہ فروشوں، ریڑھی بانوں، دکانداروں، تماشائیوں اور خریداروں سے بچتے بچاتے آگے بڑھتے گئے۔ راہ میں ہارون نے ایک بوڑھے کو دیکھا تو اسے پیرس میں کام کرنے والا ایک دوست یاد آ گیا۔ دونوں کی صورتوں میں اس قدر مشابہت تھی کہ لگتا تھا کہ یہ بوڑھا شاید اس کے دوست کا باپ ہے۔ حیران کن مشابہت۔ ایک نوجوان ہارون کی طرف بڑھا جسے یقین تھا کہ وہ اپنی جیکٹ کو بہترین قرار دیتے ہوئے ہارون کے پاس فروخت کر سکے گا۔ وہ مایوس ہو کر آگے بڑھ گیا۔

''ان گلیوں میں پھیری والوں کی بھرمار ہے بیٹا۔ بھرمار یہ کوئی اچھی بات نہیں۔''

ہارون اور اس کا باپ جب تھیلے اٹھائے گھر پہنچے تو عائشہ نے خوشی کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ اس کے ساتھ ہی طعام نامہ فوراً مکمل طور پر تبدیل کر دیا گیا۔ بعد ازاں مردوں کو صحن میں انجیر کے درخت کے نیچے کھانا دیا گیا۔ ہارون اور احمد دونوں کو عائشہ کے ہاتھ کے پکے ہوئے سیخ کباب بے حد پسند تھے۔ عائشہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب ہارون نے اسے بتایا کہ کسی ریسٹورنٹ میں بھی چاہے اس کے سٹار کتنے ہی کیوں نہ ہوں، ایسے لذیذ کباب نہیں ملتے۔ عائشہ نے اسے پیار کیا اور باورچی خانے کی طرف لوٹ گئی۔ اسے یقین تھا کہ اس کا بڑا بیٹا ماں کی ممتا کا سب بیٹوں سے زیادہ اہل ہے؟ اسے خیال آیا کہ کیا فائزہ واقعی ایسے بیٹے کی بیوی بننے کی اہل ہے؟ مرد کھانا کھا چکے تو عورتوں کی باری آئی۔ فائزہ کو عام سی گھریلو زندگی کی عادت تھی۔ وہ اس نئے خاندان کے محبوب زندگی کے روایتی طریقوں سے ہم آہنگ نہ ہو سکی۔

اس کا شوہر ہارون اس کے لیے اجنبی ہی رہا۔ ایسا اجنبی جس کی اسے ہر روز خدمت کرنا ہوتی تھی اور جو ہر شب اس پر مکمل اختیار رکھتا تھا۔ وہ یہ جاننے پر تیار نہ تھی کہ ایسی ان دیکھی اور ناقابل قبول صورت حال برقرار رہ سکتی ہے۔ وہ اسے تبدیل کرنے کے طریقوں کو تلاش کر رہی تھی۔ لیکن ابھی تک کوئی ترکیب ذہن میں نہ آئی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ سیسے کی دیوار سے سر ٹکرا رہی ہے۔ ایسی مشکلات اس پر گزر رہی تھیں کہ پہلے وہ کبھی ان سے آشنا نہ تھی۔ کبھی لگتا تھا کہ اس کے سینے پر بھاری بوجھ آن گرا ہے۔ کبھی کھانا کھاتے کھاتے اس سے لقمہ نہ نگلا جاتا۔ بوریت، تنہائی، لبوں پر لگی مہر اور شادی سے پہلے کی خوش

باش زندگی کی ہر شے سے جدائی کے احساس سے گویا وہ زندہ درگور ہوگئی تھی۔ بار بار وہ آنسوؤں کو روکتی جو خود بخود چھلک جاتے تھے۔

آستین چڑھائے فائزہ صحن میں پانی پھینک رہی تھی۔ سیمنٹ کے فرش کو اس نے جھاڑو کے ساتھ اچھی طرح دھویا۔ وہ ایسے انتقامی انداز میں کام کرتی تھی جیسے کام اس کی تنہائی، مایوسی، گھر کی یادوں، اداسیوں اور جسم و روح کے زخموں کو بھلا دے گا۔ دروازے میں کھڑی عائشہ اسے اطمینان سے دیکھ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مانوس ہونے میں فائزہ کو مشکل درپیش ہے۔ لیکن یہ بات اہم نہ تھی۔ یہ تو عارضی مرحلہ ہے۔ گزر ہی جائے گا۔ وہ محنتی ہے اور یہی اصل بات ہے۔ آہ۔ ہاں یہی اصل بات ہے۔ محنتی جوان عورت ہو تو گھر سنور جاتا ہے۔ پھر وہ اعتماد جی میں لیے باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

ہارون گھر لوٹ آیا تھا۔ کام میں مگن فائزہ کو اس کی خبر نہ ہوئی۔ وہ بیڈروم میں گیا، دروازہ کھولا اور اسے آواز دی۔ اس نے چونک کر دیکھا تو ہارون اشارے سے اسے پاس بلا رہا تھا۔ اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ قدرے تامل کیا۔ ہارون کا اصرار بڑھا تو وہ جھاڑو دیوار کے ساتھ رکھ کر صحن کے نلکے سے ہاتھ دھوتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ہارون کی آہستہ سی آواز سن کر عائشہ دوبارہ دروازے میں آئی اور صحن میں فائزہ کو دیکھنے لگی۔ وہاں تو محض جھاڑو اور بالٹی رکھی تھی۔

''فائزہ''

فائزہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ تب وہ نئے جوڑے کی کھڑکی کی طرف گئی۔ چند لمحوں تک ان کی سرگوشیاں سنیں۔ تیوری چڑھائی اور بڑبڑ کرتی ہوئی بالٹی اور جھاڑو کو ایک طرف رکھنے لگی۔ ان کو دن کے وقت بھی چین نہیں۔ وہ بیوی کو کام سے روک لیتا ہے۔ نہیں نہیں۔ یہ بری بات ہے۔ اسے اپنے بڑے بیٹے کی ادا پسند نہ آئی تھی۔ لیکن اس نے جلد ہی اس غلطی کو فراموش کر دیا۔ بیٹے سے اسے محبت جو اس قدر تھی۔ پیرس میں وہ اکیلا رہا ہے۔ یہاں اس کے پاس کوئی کام بھی نہیں۔ خیر چلو۔ وہ ہمارے لیے پوتے کا انتظام کر رہا ہے۔ خدا کی تعریف ہو۔ وہ خوشی سے مسکرا دی۔

روز کی طرح فائزہ اور ثمینہ گھر صاف کر رہی تھیں۔ ثمینہ اپنی جواں سال بھابھی

کی موجودگی سے بڑا لطف اٹھاتی تھی۔ گھر کے کبھی نہ ختم ہونے والے کام کاج میں وہ مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کی مدد کرتیں۔ جھاڑو دینا، فرنیچر کو جھاڑنا، برتن مانجھنا، سبزی بنانا، قالینوں کو صاف کرنا، چیزوں کو ان کی جگہ پر رکھنا، کھانا تیار کرنا اور ایسے ہی درجنوں دوسرے کام جو روزمرہ کی زندگی کا حصہ ہیں۔ عائشہ بھی دسترخوان بچھانے میں مصروف تھی۔ یہ کام اس کا تھا۔نعمت خانے کی چابی ہر وقت اس کے پاس رہتی جسے وہ گھر کی دوسری چابیوں کے ساتھ ازار بند میں باندھے رکھتی۔ فائزہ کو اس بات پر تعجب ہوتا کیونکہ اس کے اپنے گھر میں ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔شروع شروع میں تو اسے اس بات پر ہنسی آتی تھی۔لیکن اب وہ برا ماننے لگی تھی۔ جمال کو جب بھی موقع ملتا وہ اس نظم ونسق کے خلاف چھپ کر لیکن باقاعدگی سے جنگ کرتا۔ وہ اس نظم ونسق کو فرسودہ سمجھتا تھا۔ اسے گھر کے انداز نہ بھاتے تھے۔نوجوانوں کے خیالات۔ وہ ہر موقع پر ماں کو چھیڑتا۔ عائشہ کوئی پروا نہ کرتی۔ وہ خاموشی سے اپنے والدین اور ان کے والدین کی راہ پر چل رہی تھی۔اس کے لیے تو یہ ہمیشہ کا چلن تھا۔تو پھر آج اس میں کیا خرابی پیدا ہوگئی ہے؟

گھر کے کام کاج کے باوجود ثمینہ اور فائزہ بچوں کی طرح خود کو خوش کرنے کے مواقع ڈھونڈ لیتی تھیں۔کسی واضح سبب کے بغیر وہ ہنسنے لگتیں۔ بچوں کی حماقتوں پر خوش ہوتیں یا پھر جب وہ پرندوں کے پیچھے بھاگتے اور انہیں تیزی سے اڑتا دیکھ کر حیران ہوتے۔

''ان کے پر ہیں تو میرے کیوں نہیں ہیں؟'' علی نے کہا۔

وہ زور سے ہنسنے لگیں۔لیکن علی کو قہقہے کے بجائے جواب کی ضرورت تھی۔ اس لیے کبھی کبھی وہ ناراض ہو جاتا اور ماں کے دامن کی طرف بھاگتا۔ ماں حقائق کو جانے بغیر اس کی حمایت کرتی ''اچھا اب انہوں نے میرے بچے کو کیا کہہ دیا ہے؟''

''ہاں واقعی ان کے پر ہیں تو ہمارے کیوں نہیں؟'' فائزہ سوچنے لگی۔

اسے دونوں چھوٹے بچوں سے بہت لگاؤ تھا۔لیکن عائشہ تو کسی کو ان کے پاس نہ پھٹکنے دیتی تھی۔ ہر وقت ساتھ چمٹائے رکھتی تھی۔ وہ محبت کا مرکز بنی رہنا چاہتی تھی اور سمجھتی تھی کہ ہر شے پہلے اس کے پاس آنی چاہیے۔ ہاں وہ بعد میں خود ہی کھلے دل سے سب میں تقسیم کرے گی۔

عائشہ نے ثمینہ اور فائزہ میں بڑھتا ہوا پیار دیکھا تو یہ بات اسے ناگوار گزری۔

MashalBooks.com

کیونکہ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ فائزہ اور ہارون ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے سے رہتے ہیں۔ وہ اپنی جوان بہو کے کردار یا رویے کو اچھی طرح سمجھ نہ پائی تھی۔ اس نے خود سے کئی سوال پوچھنا چاہے جو جواب تلاش کیے بغیر اس کے ذہن میں گردش کرتے رہے۔ فائزہ اسے پوری طرح جل دے گئی تھی۔ وہ اس گھر میں ایک اجنبی کی طرح تھی۔ جیسے ملنے کے لیے آئی ہو۔ فرمانبردار، اطاعت شعار مہمان جسے معلوم ہو کہ جلد ہی وہ یہاں سے چل دے گی۔ نئی زندگی کو خوشی سے قبول کرنے کا کوئی اشارہ ابھی اس نے نہیں دیا تھا۔ نہ ہی اس کی کسی بات سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مشترک مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کر رہی ہے۔ ہارون کے ساتھ کسی مکالمے، کسی نظر، کسی شفقت سے اس محبت کے پیدا ہونے کے آثار نمایاں نہیں ہوتے تھے جس کی ضرورت زندگی کو ہوتی ہے۔ اس کے باوجود اس کا گھر یہی تھا۔ یہیں اس نے ہارون کے ساتھ رہنا تھا۔ میرے بیٹے کے ساتھ۔ اپنے شوہر کے ساتھ۔ بچوں کے ساتھ۔ کیونکہ یہ گھران سب کے لیے کافی تھا۔ عائشہ اس سارے معاملے پر اپنے بیٹے کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اسے حوصلہ نہ ہوا۔ وہ زیادہ وقت گھر سے باہر رہتا تھا۔ کام کی تلاش تھی اسے، جو ابھی تک مل نہ سکا تھا۔ خدا کرے اسے کوئی کام جلدی سے مل جائے۔ میرے بیٹے، ہم نے تمہیں بیوی لا دی ہے تم بھی ہمیں جلدی سے پوتا عطا کر دو۔ تم خوش ہو بیٹے؟

اس روز وہ کھانا پکانے کی تیاری کر رہی تھی۔ فائزہ نے سبزی چھیلی اور اپنی نند کے ساتھ ہنس کھیل رہی تھی۔ ثمینہ پیاز چھیل رہی تھی۔ فائزہ کے مذاق پر وہ چیخی تو بچے دور بھاگ گئے۔

''دیکھو ثمینہ، تم اچھی باورچن بننا چاہتی ہو تو پھر ہر کام سلیقے سے کرنا ہوگا۔ یہی بات میری ماں کہا کرتی تھی۔ ورنہ سب کچھ خراب ہو جاتا ہے۔''

دونوں ہنسنے لگیں۔ عائشہ باورچی خانے میں داخل ہوئی۔

''ثمینہ آؤ میں تمہیں کوئی اور کام دوں۔ فائزہ خود ہی یہ کام نمٹا لے گی۔''

ثمینہ منہ بسورتے ہوئے ماں کی پیچھے ہو لی۔ فائزہ خوب جانتی تھی کہ اس کی ساس دونوں کو ایک ساتھ ہنستے بولتے نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کا سبب اسے معلوم نہ تھا۔ پھر بھی وہ کوئی ردعمل ظاہر کیے بغیر اپنا کام کرتی رہی۔ اس بات سے عائشہ اور بھی چڑ گئی۔

اسے بے نیازی کا یہ انداز پرفریب لگا۔ اب کچھ عرصے سے وہ دونوں کو اس قدر زیادہ الگ تھلگ رکھنے لگی تھی کہ یہ کام بلا ارادہ نہیں ہوسکتا تھا۔ فائزہ نے یوں کام جاری رکھا جیسے کچھ نہ ہوا ہو۔ صفائی کرنا، چیزوں کو سمیٹنا، دھونا، استری کرنا، کھانا پکانا۔ ان تمام کاموں میں وہ وقت صرف ہو جاتا تھا جو اب اس کا اپنا نہیں لگتا تھا۔ عارضی پن کا احساس اور کبھی کبھار یہ یقین کہ مستقبل حال سے مختلف ہوگا (کیونکہ حال وہ نہ تھا جس کی اس نے زندگی سے توقع کی تھی) حقائق سے ٹکراتا تھا۔ حقائق یہ ظاہر کر رہے تھے کہ چیزیں بدلا نہیں کرتیں۔ چاروں طرف دیواریں ہیں۔ رکاوٹیں ہی رکاوٹیں ہیں۔

عائشہ صحن میں بیٹھ کر سینے پرونے کے کام میں مصروف تھی۔ ہارون گھر آیا تو اس نے بازو پھیلا دیے۔ وہ ماں کے پاس آیا تو اس نے اسے بھی انجیر کے درخت کے نیچے بٹھا دیا۔ وہ ایسی محبت سے اسے تک رہی تھی کہ اسے انکار کرنا محال تھا۔ سورج بھی اس کی آنکھوں سے زیادہ گرم نہ تھا۔

''بیٹا تمہارے ابا سٹی ہال گئے ہیں۔تم بیٹھ جاؤ۔ کافی پیو گے؟''

''ہاں۔شکریہ۔''

عائشہ نے فائزہ کو آواز دی۔

''فائزہ بیٹی ہمارے لیے کافی تو بنانا۔''

انجیر کے درخت تلے ماں بیٹا خاموشی سے ایک دوسرے کے قریب بیٹھ گئے۔ پھر جیسے عائشہ کو اختیار نہ رہا ہو۔اس نے وہ سوال پوچھ ہی لیا جو کئی دنوں سے اسے تنگ کر رہا تھا۔

''بیٹا تم خوش ہو؟''

ہارون مسکرایا۔

''بیوی خاوند کا عکس ہوا کرتی ہے بیٹا۔ اگر تم خوش ہو تو وہ بھی خوش ہے۔''

ہارون نے کچھ نہ کہا اور عائشہ بھی مضطرب خاموشی کو توڑنے کی ہمت نہ کرسکی۔ فائزہ نے کافی دی اور باورچی خانے میں واپس چلی گئی۔

دوسرے روز عائشہ کے بچپن کی ایک سہیلی کی چھوٹی بہن مالکہ اپنے شہر سے آئی۔ اس کا خوبصورت، کشادہ ہنستا مسکراتا چہرہ تھا۔اور وہ اپنی بہن کی طرح خوش باش، متحرک اور پرکشش تھی۔ عائشہ کو اس کی بہن سے بہت پیار تھا۔اب بھی اسے بہت چاہتی تھی۔ دونوں کے

MashalBooks.com

پاس ایک دوسرے کو بتانے اور ایک دوسرے سے سننے کے لیے بہت کچھ تھا۔

''بڑا افسوس ہے کہ میں تمہارے بیٹے کی شادی میں شریک نہ ہوسکی۔ فوزیہ کو بھی بہت رنج ہے۔ میں نے سنا ہے کہ تم نے بہت اچھا انتخاب کیا ہے۔ تمہاری بہو تو سکول بھی جاتی رہی ہے۔''

''سکول۔ اری بہن اہم بات یہ ہے کہ وہ کھانا پکانا اور گھر کا کام کاج کرنا جانتی ہے۔ آج کل تو بہت سی لڑکیوں کی شادی ہو رہی ہے جنہیں روٹی پکانی بھی نہیں آتی۔''

دونوں ہنسنے لگیں۔

''وقت بدل گیا ہے عائشہ۔ نئی نسل ہماری طرح تو نہیں ہوسکتی۔ دیہات میں بھی ہر شے بدل رہی ہے۔''

''عورتیں عورتیں ہیں اور مرد مرد ہیں۔ یہ بات تو اپنی جگہ ہے۔ یہ تو نہیں بدل سکتی۔''

وہ پھر ہنس دیں۔

'میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ میرا نہیں خیال کہ فائزہ ٹھیک ہے۔ شاید۔''

''کیا؟ ابھی سے؟''

''تم تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو۔''

''اور تمہاری بہو؟''

''اسے تو کچھ کرنا نہیں آتا۔''

''تم مبالغہ سے کام لے رہی ہو۔ ہیں نا؟''

''نہیں۔ بالکل مبالغہ نہیں۔''

''اور تمہارا بیٹا؟''

''وہ اب کہاں دکھائی دیتا ہے۔ بہو نے تو اس پر جادو کر دیا ہے۔ بس اسے یہی کرنا آتا ہے۔''

''تمہاری بہو احمق نہیں ہے۔ ہم بھی اپنے مردوں کو اسی طرح قابو میں رکھتی ہیں۔''

دونوں اسی طرح ہنسنے لگیں جیسے وہ کبھی گاؤں میں ہنسا کرتی تھیں۔

''نوجوان عورتیں ہمیں طعنہ دیتی ہیں کہ ہم مردوں کی کنیزیں ہو کر رہ گئی ہیں اور یہ کہ وہ اب اس طرح نہیں رہنا چاہتیں۔ لیکن مرد بھی تو ہمارے غلام ہیں۔''

MashalBooks.com

اب وہ پہلے سے زیادہ زور سے ہنسیں۔ جمال صحن میں داخل ہوا اور مالکہ نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔

''جمال، تم کتنے بڑے ہو گئے ہو۔ اب تو بالکل مرد بن گئے ہو۔''

جمال نے مالکہ کو بوسہ دیا اور چپکے سے کھسک گیا۔ عائشہ تعریفی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کیا ہی خوبصورت لڑکا ہے۔ بیوی تلاش کی اس کے لیے؟''

''ابھی نہیں۔ ویسے یہ کوئی آسان کام بھی نہیں۔ وہ دوسروں کی طرح کوئی کام نہیں کرنا چاہتا۔ سب کے منہ آتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے باپ کے بھی۔ کہتا ہے کہ میں ہارون کی طرح شادی نہ کروں گا۔ پہلے وہ اپنی بیوی کو دیکھے بھالے گا اور وہ بھی اسے جانے گی۔ پھر دونوں ایک دوسرے کا انتخاب کریں گے اور ایک دوسرے سے محبت کریں گے۔''

''مجھے یہ سارا قصہ معلوم ہے۔ خیر تمہارے بڑے لڑکے کی شادی تو ہو گئی۔ اب اس سال تمہیں خوبصورت پوتا بھی مل جائے گا۔''

''بہو کے متعلق ایک پریشانی ہے۔ وہ چپ رہتی ہے اور اداس سی لگتی ہے۔''

مالکہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''سچ ہے۔ تم خود ہی دیکھ لو گی۔ مجھے تو اس کی سمجھ ہی نہیں آتی۔ مجھے معلوم نہیں کہ آیا وہ دونوں خوش ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ ہارون یہیں ہمارے پاس رہے۔ میں تو دعائیں مانگا کرتی تھی کہ وہ وطن واپس آ جائے اور یہیں کی عورت سے شادی کرے۔ مجھے بڑا ڈر تھا کہ کہیں وہ فرانس ہی میں نہ بیاہ رچا لے۔ اب میں نہیں چاہتی کہ وہ واپس جائے۔''

مالکہ کو اپنی سہیلی کے دکھ کا احساس تھا۔ اس کا اپنا بڑا بیٹا کام کی غرض سے جرمنی گیا تھا اور واپس ابھی تک نہ آیا تھا۔ سنا تھا کہ وہ وہاں ایک جرمن عورت کے ساتھ رہتا ہے۔ آہ، وہ اس بات کو بھلا دینا چاہتی تھی۔

''اب وہ واپس نہ جائے گا۔ اسے یہاں اکیلا نہیں چھوڑے گا۔ بس۔ تم فکر نہ کرو۔ فکرمندی تو بوڑھا کر دیتی ہے اور تم جانتی ہو کہ ہمیں بوڑھا ہونے کا ابھی کوئی حق نہیں۔''

اس بات پر وہ دونوں پھر ہنسنے لگیں۔

''مالکہ، میری دوست، تم ابھی تک جوان ہو۔ یہاں چند روز نہ ٹھہرو گی؟ تمہارے آنے سے مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے۔لیکن یہ تم کن میڈیکل ٹیسٹوں کا ذکر کر رہی تھیں؟ مجھے تو یہ پسند نہیں۔ پہلے تو ہم ان سب کے بغیر اپنا خیال خود ہی رکھتے تھے اور گھاٹے میں بھی نہ تھے۔نہ ہی اب سے زیادہ مرتے تھے۔''

مالکہ ہنسنے لگی۔

''میں مرنا نہیں چاہتی۔''

''میرا مطلب بھی یہ نہ تھا......''

دونوں بغل گیر ہو گئیں۔

''ہم عورتوں کے ساتھ ہمیشہ کوئی نہ کوئی مسئلہ ہوتا ہے۔لیکن کوئی فکر کی بات نہیں۔تم ٹھیک ٹھاک دکھائی دیتی ہو۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ تم روز بروز جوان ہوتی جا رہی ہو۔''

عائشہ فکر مند تھی۔اس نے اپنی سہیلی کا بازو پکڑا اور گھر کی طرف لے گئی۔اس نے زندگی کی مشکلات پر ملامت کی ایسے سوالوں کے لیے جن کا جواب موجود نہیں۔ بیماری کے لیے جو وارننگ کے بغیر آ جاتی ہے۔میڈیکل ٹیسٹوں کے لیے جو کروانے ہی پڑتے ہیں۔شادیوں کے لیے جو اب پہلے جیسی نہ رہی تھیں۔ بیٹوں کے لیے جو روایت شکنی پر آمادہ رہتے ہیں۔اس نے لمبی آہ بھری۔لیکن مالکہ اسے سن نہ سکی کیوں کہ بچے خوشی سے شور مچاتے اس کے بازوؤں میں آ گئے تھے۔

احمد، ہارون اور جمال کھانے سے فارغ ہوئے تو صحن کی ٹھنڈی شام میں عورتوں نے کھانا شروع کیا۔ عائشہ نے مالکہ کے لیے خاص کھانا تیار کیا تھا اور وہ خوب مزے سے کھا رہی تھی۔ثمینہ پانی اور کھانوں کے لیے بار بار باورچی خانے سے صحن کی طرف پھیرے لگا رہی تھی۔ پھر وہ فائزہ کے ساتھ بیٹھ گئی جسے مالکہ گاؤں کی باتیں بتاتے ہوئے وقتاً فوقتاً توجہ سے دیکھ رہی تھی۔ وہ شادیوں، پیدائشوں، بیماریوں، جھگڑوں، صلحوں اور اموات کا ذکر کر رہی تھی۔

فائزہ ان باتوں سے بے نیاز ممنوعہ گلی سے آنے والی گیت کی آواز سن رہی تھی۔ یہ گیت ریکارڈوں کی دکان پر بج رہا تھا۔فائزہ کی خواہش تھی کہ وہ خود بھی اس دکان

پر جانے، اپنی پسند کا ریکارڈ چننے اور نئے ریکارڈ دیکھنے کے قابل ہوتی۔ لیکن اسے اس بات کی اجازت نہ تھی۔ باتیں کرتے کرتے مالکہ نے ان تمام مسائل کا اندازہ بھی کرلیا جو اس کی سہیلی کو اپنی بہو کے سلسلے میں پیش آ سکتی تھیں۔ آخر وہ انسانی فطرت کو جاننے کی ماہر جو تھی۔ وہ اپنے خیالوں میں دور پہنچی ہوئی تھی۔ غیر مطمئن اور بے چین تھی۔ اگر چہ فائزہ نے کھانا تیار کرنے میں خوشی خوشی حصہ لیا تھا، لیکن جب اس سے لطف اٹھانے کا وقت آیا تو اس کی بھوک مر چکی تھی۔

فائزہ کے ساتھ لیٹے ہوئے ہارون نے اپنا سگریٹ ختم کیا اور ایش ٹرے میں پھینک دیا۔ اس نے پہلو بدلا اور فائزہ کو چومنا چاہا۔ لیکن اس نے اسے پیچھے دھکا دیا اور پہلو بدل کر لیٹ گئی۔ وہ ناگواری اور گھبراہٹ کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا۔

بیڈروم کے ساتھ والی بیٹھک میں ٹیلی ویژن پر فٹ بال کا میچ دکھایا جا رہا تھا۔ فائزہ اور ہارون دونوں میچ پر کیے جانے والے جوشیلے تبصرے کی آوازیں سن سکتے تھے۔ ہارون نے چاہا کہ وہ بھی میچ دیکھے۔ لیکن فائزہ اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہ رہی تھی۔ وہ اس سے باتیں کرنا، شکوک کو رفع کرنا اور اپنے احساسات سے آگاہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ خوش نہیں ہے اور یہ کہ وہ اس انداز سے جینے کی ہمت نہیں رکھتی کہ اسے شادی سے پہلے کی طرح اب باہر نکلنے کی بھی آزادی نہ ہو۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی لیکن ہارون خفا اور برہم تھا۔ اچانک اس نے پہلو بدلا، اسے اپنے بازوؤں میں بھینچا اور ایک بار پھر چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔

بچوں کا کمرہ چھوٹے سے گھونسلے کی طرح انسانی حرارت سے تمتما رہا تھا۔ جمال اور علی ایک دوسرے کے مقابل گدوں پر سوئے ہوئے تھے۔ ثمینہ اور نفیسہ کمرے کے دوسرے کونے میں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو خوابیدہ تھیں اور آج کی رات مالکہ کمرے کے وسط میں سوئی ہوئی تھی۔ بچوں کے سانس لینے کی آواز سنی جا سکتی تھی۔ لیکن مالکہ ابھی تک جاگ رہی تھی۔ اس کی پریشانیاں اسے سونے نہ دیتی تھیں۔ اسے ڈر تھا کہ ہسپتال میں اسے معائنے کے لیے روک لیا جائے گا۔ وہ وہاں پہنچنے سے پہلے ہی بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اور پھر انہوں نے دیکھنا بھی کیا تھا؟ ان پریشان کن حالات سے نجات پانے کے لیے مالکہ دن کے واقعات یاد کرنے لگی۔ عائشہ اور اس کی بہو، دلکش مگر اجنبی اجنبی

سی ۔ جیسے وہ کسی اور دیس سے آئی ہو۔

جمال بھی جاگ رہا تھا۔خواہش اسے چین نہیں لینے دیتی تھی ۔ بار بار اسے اس مالدار، پرکشش اور گرم خون عورت کا خیال آ رہا تھا۔ اسے مالکہ کی نگاہیں، سراہنے والی نگاہیں، اس کی مسکراہٹ، اس کا چہرہ یاد آ رہا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ بچے نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ثمینہ کے سانس لینے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ وہ پرسکون تھی۔

اپنے کمرے میں عائشہ اور احمد ابھی جاگ رہے تھے۔ عائشہ نے ایک لمبی آہ بھری۔

''بی بی تم اس طرح آہیں کیوں بھر رہی ہو۔تم ہر وقت کروٹیں بدلتی رہتی ہو اور مجھے بھی جگا دیتی ہو۔''

''مجھے مالکہ کے متعلق پریشانی ہے۔ہسپتال میں اس کے ٹیسٹ ہونے والے ہیں۔''

''مگر دیکھنے میں تو وہ صحت مند لگتی ہے۔کوئی خاص بات تو یقیناً نہ ہوگی۔''

''اوہ، تمہارے لیے تو کوئی خاص بات نہیں ہوتی۔ اور پھر فائزہ کا معاملہ؟ تم نے کوئی بات نہیں دیکھی؟''

''کیسی بات؟''

''دیکھتے نہیں کہ وہ ہر وقت خاموش رہتی ہے۔ خدا جانے کن خیالوں میں کھوئی رہتی ہے۔ہمارے بیٹے کے پلے تو گونگی بندھ گئی ہے۔اور تم سمجھتے ہو کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔''

''اس میں کیا برائی ہے؟ زیادہ بولنے سے کم بولنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ پھر وہ بھی تو باتونی نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے موزوں ہیں۔''

''لیکن اگر ہم اس کے متعلق غلط فہمی میں ہوئے تو؟ ہمارا بیٹا خوش نہ ہوا تو؟''

اس نے پھر آہ بھری۔خفا ہو کر احمد نے پہلو بدلا۔

''اچھا اب سو جاؤ۔''

عائشہ خاموش ہوگئی اور ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ خوب جانتی تھی کہ جب کبھی اسے کوئی دکھ ہوتو اس کی بات کو سمجھا نہیں جاتا۔ پھر وہ اکیلے ہی سوچتی رہتی یہاں تک کہ خیالات خود بخود محو ہو جاتے یا پھر وہ جذبات سے مغلوب ہو کر بیمار سی ہو جاتی۔

ہارون نے کپڑے پہنے اور کوئی لفظ کہے بغیر کمرے سے نکل گیا۔ فائزہ اپنے گھٹنوں میں سر دیے رو رہی تھی۔ وہ اپنے دکھ، اپنی مایوسی اور اپنی تنہائی کے کرب میں

MashalBooks.com

گرفتارتھی۔

ہارون صحن میں ٹہلنے لگا۔اس نے سگریٹ جلایا اور آسمان کی طرف دھواں پھینکنے لگا۔آج کل وہ دو تین پیکٹ روزانہ پی رہا تھا۔اس لیے کسی شے کی خوشبو اسے کم ہی آتی تھی۔لیکن اس لمحے جب کہ ہلکی ہلکی ہوا دھوئیں کو پرے لے جا رہی تھی اور اس کے تمام حواس تنے ہوئے تھے،اس نے الجزائری سٹی کی بھاری خوشبو محسوس کی جو اسے بیتے دنوں کی یاد دلا رہی تھی۔لیکن آج اسے اس ماضی میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔اس کی مطلق تنہائی،اس کے اکھڑے ہونے،اس کی تشویش اور محبت کی بے ہودگی کا احساس اور بھی شدید ہو گیا۔وہ فائزہ کی کرب انگیز نگاہوں سے بھاگ رہا تھا۔وہ اس کی توقعات سے فرار چاہتا تھا۔بلاشبہ وہ ان توقعات سے بے خبر نہ تھا،لیکن اس لیے مسترد کر دیتا تھا کہ شاید وہ ان کی تکمیل نہ کر سکے۔اسے بس دوسروں سے فاصلہ ناقابل عبور ہو جانے پر خاموش ہو جانا ہی آتا تھا۔آخر وہ فائزہ سے کیا کہہ سکتا تھا؟ وہ اس کی زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتی تھی نہ ہی اسے کبھی اس بارے میں علم ہو گا۔شاید وہ اسے سمجھنے کی اہل بھی نہ ہو۔آخر ہم اپنے بیتے لمحوں کا ابلاغ دوسروں تک کیسے کر سکتے ہیں؟ پھر اس کی ضرورت بھی کیوں ہے؟ اس نے اس قدر کربناک تنہائی کے عالم میں زندگی بسر کی تھی کہ اب اسے یقین ہو چکا تھا کہ زندگی کا انداز ہی یہی ہے۔وہ محبت اور مکمل سپردگی والی موجودگی تو قبول کر سکتا تھا،لیکن اس نوجوان لڑکی کو قبول کرنا اس کے بس کا روگ نہ تھا جو پوشیدہ شکایتوں سے بھری ہوئی تھی۔شاید اس کی اکثر شکایتیں لاشعوری تھیں۔وہ اس کے جسم سے بھی نالاں ہو رہا تھا جو خواہش کے لمحے میں اس کا ساتھ نہ دیتا تھا۔ہارون صحن میں ادھر ادھر گھومتا رہا اور فرانس واپس جانے کی خواہش پیدا ہوتی رہی۔اس لیے نہیں کہ وہاں اسے چین ملتا تھا بلکہ اس لیے کہ یہاں کے مقابلے میں وہ وہاں کے مسائل سے زیادہ مانوس ہو چکا تھا۔وہاں اس کی تنہائی فطری لگتی تھی۔وہ اس میں ڈوب جاتا۔حتیٰ کہ وہ سکون بخش ہو جاتی۔

ادھر ہارون فرانس واپس جانے کے لیے خود کو آمادہ کر رہا تھا اور ادھر احمد اور عائشہ جسم و روح کی پوری گہرائیوں کے ساتھ ایک دوسرے کو پیار کر رہے تھے۔دونوں ایک دوسرے کے اس قدر گرویدہ،اس قدر آشنا تھے کہ زندگی کے بہت سے برسوں اور بہت سے دکھوں کے بعد بھی ان کی محبت پر جوش تھی۔ان کا پیار نہ دبنے والی آرزو کی طرح

توانا تھا۔ ہر دم اس میں نئی تازگی اور قوت کا احساس ہوتا تھا۔

اگلے دن مالکہ واپس جانے کا ارادہ کر چکی تھی۔

''لیکن بہن تم تو بہت سے دن یہاں رہنا چاہتی تھیں؟''

''ہاں۔مگر میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ میں تمہیں یہ بتانا بھول گئی تھی کہ مجھے اپنے سسرال بھی جانا تھا۔خواب میں میں نے یہ دیکھا ہے کہ مجھے فوراً وہاں جانا چاہیے۔''

''اچھا تو تمہارے میڈیکل ٹیسٹوں کا کیا بنے گا؟''

''وہاں بھی ایک ہسپتال ہے۔''

''ذرا انتظار کرو تو ہارون آجائے گا اور تمہیں اسٹیشن تک چھوڑ آئے گا۔''

''اس تکلیف کی کوئی ضرورت نہیں۔تمہیں پتہ ہے کہ مجھے راستہ آتا ہے اور میرا سوٹ کیس بھی بھاری نہیں۔''

مالکہ نے اپنی سہیلی کو خوب پیار کیا۔ عائشہ اس کی اچانک روانگی سے دل گرفتہ ہو رہی تھی کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

اس وقت جمال اندر داخل ہوا۔

'مالکہ وقت سے پہلے ہی جا رہی ہے۔تم ذرا اسے اسٹیشن تک چھوڑ آؤ۔ٹھیک ہے؟''

''نہیں بہن۔تم کسی کو تکلیف نہ دو۔سوٹ کیس بھاری ہوتا تو اور بات تھی۔ اب تو فضول ہے۔تم پر خدا کی رحمت ہو۔تم سب پر خدا کی رحمت ہو۔''

اس نے دوبارہ محبت سے عائشہ کو چوما اور روانہ ہو گئی۔

عائشہ نے اسے جاتے ہوئے دیکھا تو سرگوشی میں کہنے لگی۔

''وہ یقیناً خواب کی وجہ سے اتنی جلدی نہیں جا رہی۔آخر بات کیا ہے؟'' جمال انجیر کے درخت کی طرف بڑھا۔

''کیا؟ اسے خواب آیا تھا؟''

''وہ ضرور ڈر گئی ہو گی!''

وہ ہنسنے لگا۔

''گستاخ۔تم کسی کا احترام ہی نہیں کرتے! ہر وقت ہنستے رہتے ہو۔'' عائشہ غصے سے اس کی طرف لپکی۔

قدرے ملال کے ساتھ وہ اندر چلی گئی۔ چیختے چلاتے بچے بھی ماں کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ جمال درخت کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس نے ایک بچے کو پکڑ لیا۔ روتی منہ بسورتی نفسیہ کو۔

''اس نے میرا گیند چھین لیا۔''

''تو پھر واپس لے لو۔''

فائزہ ابھی فرش دھو کر فارغ ہوئی تھی۔ ریڈیو سے شطرنج کا ایک سبق نشر ہو رہا تھا لیکن فائزہ کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ صفائی کا کام بند کر کے وہ گدے پر بیٹھ گئی۔ ایک لمحے کے لیے لیٹی۔ پھر اٹھ بیٹھی اور انگلیوں کے ناخن دیکھنے لگی۔ پھر اس نے ریڈیو پر سٹیشن بدلا۔ خاموشی۔ پھر ایک گیت سنائی دینے لگا۔ واہ واہ۔ فائزہ غور سے سننے لگی اور گانے کے بول گنگنانے لگی۔ اپنے آپ میں خوش اس نے ناچنے کے لیے چند قدم اٹھائے۔ اسی لمحے ہارون اندر داخل ہوا اور اس نے فائزہ کو کمرے کے وسط میں دیکھا۔ گھر بار صاف کرنے کا سامان ادھر ادھر بکھرا پڑا تھا۔ اس نے ریڈیو بند کر دیا۔

''اپنا نقاب اوڑھو۔ ہم تمہارے لیے جوتے لینے جا رہے ہیں۔ ماں کہہ رہی تھی کہ تمہیں جوتوں کی ضرورت ہے۔''

فائزہ حیران رہ گئی اور بے حس و حرکت اسے دیکھنے لگی۔

''اچھا تو تم انتظار کس بات کا کر رہی ہو؟ مجھے اسے طرح کیوں گھور رہی ہو۔ ابھی مجھے پہچانتی نہیں ہو؟''

''نقاب کس لیے؟ میں نے تو کبھی نقاب نہیں اوڑھا۔''

''اب تم شادی شدہ عورت ہو۔ تمہیں یہ بھی پتہ ہے کہ میرے والدین شرم و حیا کا کس قدر خیال رکھتے ہیں۔''

''مجھے کیا۔ میں نقاب نہیں پہنوں گی۔''

''یا تو تم نقاب پہنو گی یا ہم باہر نہیں جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے، ہم باہر نہیں جائیں گے۔''

اس نئی مدافعت سے حواس باختہ ہو کر ہارون نے فائزہ کو دیکھا۔ اس کی حاکمیت کا احساس شدید مجروح ہوا تھا۔

MashalBooks.com

''ہم باہر جائیں گے اور تم نقاب بھی اوڑھو گی؟ آخر تم کیا چاہتی ہو؟ مردوں سے بلکہ بچوں سے بھی بدتمیزی کروانا۔ تم چاہتی ہو میرا مذاق اڑایا جائے۔ میں آج تمہیں بتادوں تم باہر نکلو گی تو نقاب پہن کر ورنہ کبھی گھر سے باہر قدم نہ رکھو گی۔''

فائزہ نے بھی ہارون کو گھورا۔ دونوں ایک دوسرے کے مدمقابل تھے۔ آخر کار فائزہ نے شوہر کے چہرے سے آنکھیں ہٹالیں۔ اس نے اپنا پیش بند اتارا اور نقاب اٹھا لیا جو اس کی ماں جاتے ہوئے کپڑوں کی الماری میں رکھ گئی تھی۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ یہ نقاب وہیں پڑا رہے گا۔ آہستگی سے اس نے نقاب سے چہرہ ڈھانپا اور چغے میں اپنے آپ کو لپیٹ لیا۔ بظاہر وہ شکست مان چکی تھی لیکن ہارون اس کی مدافعت ختم نہ کر سکا تھا۔ اس نے نقاب اوڑھتے دیکھا تو سمجھا کہ وہ جیت چکا ہے۔ لیکن اس جھگڑے سے دونوں ایک دوسرے سے زیادہ نالاں ہو گئے تھے۔ ان کے درمیان خلیج بڑھ گئی تھی۔

بازار میں ہارون کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے فائزہ کو شکست کا احساس تھا اور اس بات کی خوشی بھی تھی کہ اس نے گھر سے باہر قدم رکھا ہے۔ نقاب اوڑھنے کے باوجود اسے بازار میں ہونے، لوگوں کو دیکھنے، دکانوں پر جانے اور گھر سے باہر ہونے کی خوشی تھی۔ پہلی بار اس نے ہارون کو طیش دلانے کی خواہش محسوس کی۔ ایک لمحے کے لیے اس کا جی چاہا کہ نقاب اتار دے اور ہارون کے پیچھے پیچھے عریاں چہرے کے ساتھ چلتی رہے۔ وہ کیا کرے گا؟ کیا کہے گا؟

اس کے اندر کوئی شے بغاوت پر آمادہ تھی اور اسے اس بات کا شعور بھی تھا۔ وہ بھاگنا چاہتی تھی مگر صرف چل رہی تھی۔ وہ نقاب کو اتار پھینکنا چاہتی تھی مگر اسے قبول کیے ہوئے تھی۔ وہ مجبور تھی۔

ہارون نے جوتوں کی ایک دکان منتخب کی اور وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گئی۔ یورپی انداز کا لباس زیب تن کیے فائزہ کے عمر کی ایک جوان خاتون کسی نقاب کے بغیر اکیلی ہی دکان میں جوتے دیکھ رہی تھی۔ فائزہ نے اسے دیکھا۔

''تمہیں کس قسم کے جوتے پسند ہیں؟ جلدی کرو۔ ہم یہاں بیٹھنے نہیں آئے۔ مجھے یہاں کے شوسٹورز سے نفرت ہے، بلکہ ہر جگہ کے شوسٹورز سے نفرت ہے۔''

''ہم الجیرس کیوں نہ چلے جائیں۔ میرے بھائی کے ساتھ ہم......''

''ہاں۔ ہاں۔ پیرس کیوں نہ چلے جائیں۔ یہاں کافی جوتے نہیں ہیں کیا؟ تمہیں کیسے چاہئیں؟''

فائزہ نے ان جوتوں کی طرف اشارہ کیا جنہیں وہ عورت منتخب کر چکی تھی۔شاید وہ اس طرح ہارون کی توجہ اس کی طرف دلانا چاہتی تھی۔لیکن وہ پہلے ہی اسے دیکھ چکا تھا۔ تیزی سے وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''مجھے بھی وہ اچھے لگتے ہیں۔''

وہ دکان کے باہر شوکیس میں رکھے ہوئے جوتوں کو دیکھنے لگی۔سیلز مین بھی اس کے پیچھے ہولیا۔کچھ دیر وہ جوتے دیکھتی رہی۔اندر ہارون بے چین ہو رہا تھا۔فائزہ کو اس بات میں لطف آیا۔

''مادام آپ ٹھیک کہتی ہیں۔پسند کی چیز ڈھونڈنے میں وقت تو لگتا ہی ہے۔''

فائزہ نے بہت سے جوتوں کو آزمایا۔اپنے پاؤں پر غور کیا اور سیلز مین کے مشورے پر بھی توجہ دی جو اس کی خدمت کرتے ہوئے نہ صرف اس کی پسند اور موڈ کو جان گیا تھا بلکہ اس کی اداسی کو بھی بھانپ گیا تھا۔

''میں تو یہ جوڑا خریدنا چاہتی ہوں۔تمہاری کیا رائے ہے؟''

''میرے خیال میں تو یہ آپ کے لیے بہت مناسب ہیں۔آپ کے پاؤں اس میں آسانی سے پورے آجائیں گے۔''

فائزہ اپنے شوہر کو نظر انداز کر کے سیلز مین سے باتیں کرنے میں لطف لے رہی تھی۔

''تو پھر آپ نے فیصلہ کر لیا یا نہیں؟''

''ہاں، میں یہی جوتے لوں گی۔''

فائزہ یوں ظاہر کر رہی تھی گویا وہ ہارون کے اضطراب سے بے خبر ہو اور نہ ہی اسے سیلز مین سے یوں باتیں کرنے پر اس کی ناراضی کا علم ہو جو ہارون کے خیال میں ضرورت سے زیادہ بے تکلفانہ تھیں۔ہارون نے پیسے ادا کیے اور وہ دونوں دکان سے نکل آئے۔

''یہ سیلز مین تمہیں اچھا لگتا ہے؟''

''مجھے؟ میں جوتے پسند کر رہی تھی۔اگر تم میں اتنا صبر بھی نہیں تھا تو تم مجھے وہاں اکیلا چھوڑ سکتے تھے۔تم نے وہاں نقاب کے بغیر نوجوان عورت کو نہیں دیکھا تھا؟ اسے تو

کوئی کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ کوئی اس کی بے عزتی نہیں کر رہا تھا۔ میں خود اکیلے دکانوں پر جایا کرتی تھی اور لطف بھی آتا تھا۔ تمہارے ساتھ تو......''

وہ غضب ناک ہو کر کھڑا ہو گیا۔

''کیا مطلب؟''

''تمہارے ساتھ۔''

''میرے ساتھ؟''

اس کا لہجہ اس قدر غضب ناک تھا کہ فائزہ نے خاموش رہنے میں ہی مصلحت دیکھی۔ ہارون کا جی تو چاہتا تھا کہ فائزہ کے ہاتھوں سے پیکٹ چھین کر بازار کے بیچ پھینک دے لیکن اس نے کیا بس یہی کہ پہلے کے مقابلے میں تیز تیز چلنے لگا۔

ہارون کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس کے اندر کا تشدد پھر جاگ پڑا ہے۔ مدتوں پہلے وہ کبھی اس قسم کے جذبوں کا شکار ہوا کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اب وہ ان سے محروم ہو چکا ہے۔ شانت ہو چکا ہے اور ہر شے سے بے نیاز ہو گیا ہے۔ وہ اب کبھی لڑتا بھی نہ تھا۔ جو ہوتا سو ہوتا۔ وہ اپنے حال میں مست رہتا۔ لیکن اب غصہ پھر سے لوٹ آیا تھا اور وہ بھی اس نوجوان عورت، اس کی بیوی پر۔ یوں شادی خوشی اور سکون کا سبب بننے کے بجائے جھگڑوں، مایوسیوں اور تشدد کی بازیافت کا موجب بن گئی تھی۔ اسے یہ تشدد پسند نہ تھا۔ وہ کوئی جھگڑا نہیں چاہتا تھا۔

ہارون میں اشتعال پیدا کر کے فائزہ ناخوش نہ تھی۔ اصل میں یہ اس حاکمیت کے خلاف اس کا غیر شعوری ردعمل تھا جس کا نشانہ وہ شادی کے بعد سے بن رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ بالآخر وہ ایک دوسرے سے بول چکے تھے۔ یہ کوئی مکالمہ تو نہ تھا۔ بلکہ ایک طرح کا تصادم تھا۔ پھر بھی لفظوں اور اس عام سے حادثے کے ذریعے فائزہ نے اس خاموشی کو توڑ دیا جو اسے دق کر رہی تھی۔ اس نے شوہر سے بات کرنے کی ہمت کر لی تھی۔ اپنی بات منوانے پر اتر آئی تھی اور وہ ناراض ہو کر رہ گیا تھا۔ گویا اس نے شوہر کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی۔ اب وہ نہ صرف خود کو زیادہ مضبوط محسوس کر رہی تھی بلکہ شوہر کے قریب تر ہونے کا احساس بھی اسے ہو رہا تھا۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہ رہے تھے۔

شام بے حد خوبصورت تھی۔ ہارون کا جی چاہا کہ فائزہ کو لے کر دریا کی طرف جائے۔

’’آؤ بھئی، اپنا نقاب اوڑھ لو۔ ہم ذرا سیر کر لیں۔‘‘

فائزہ کو ہارون کی تجویز اور لہجے پر تعجب ہوا جو تحکمانہ سے زیادہ دوستانہ تھا۔ لیکن ’نقاب اوڑھو‘ کے مسئلے پر وہ چند گھنٹے پہلے کی طرح پھر چڑ گئی۔

’’لیکن اب تو باہر اندھیرا ہو چکا ہے۔‘‘

’’ہاں خوبصورت شام ہے، پر تم نقاب اوڑھ لو۔‘‘

’’اچھا تو مجھے رات کو بھی نقاب اوڑھنا ہوگا۔‘‘

’’دوبارہ جھگڑا نہ کھڑا کرو۔ سمجھیں۔‘‘

فائزہ نے چپکے سے نقاب اوڑھی۔ ہارون نے اندھیرے میں چلنے میں مدد دینے کی خاطر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اس نے اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیا۔ ہارون کا ہاتھ اب پسندیدہ اور دوستانہ تھا۔ لگتا تھا کہ وہ رات کو لمبے وقت کے لیے سیر پر جا رہے ہوں یہاں تک کہ وہ دوست بن جائیں، ایک دوسرے سے آشنا ہو جائیں، ایک دوسرے سے باتیں کرنے کی خواہش محسوس کریں، ایک دوسرے کو گلے لگانے اور چومنے کو جی چاہنے لگے کیونکہ وہ ایک مرد تھا اور وہ ایک عورت۔ اس لیے بھی کہ دونوں تنہا تھے لیکن شادی کے بندھن نے انہیں زندگی بھر کے لیے ملا دیا تھا۔ اس لیے بھی کہ وہ دونوں جھگڑے کے بجائے محبت کے متلاشی تھے۔ ہارون اچانک کھڑا ہو گیا اور فائزہ اس سے جا ٹکرائی۔ ہارون نے اس کا نقاب اٹھایا اور اسے گرفت میں لے کر چومنے لگا۔ وہ وہیں زمین پر آسمان کے نیچے محبت کا کھیل رچانا چاہتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ محض اس کا جسمانی تقاضا ہو جو مدتوں تک عورت سے محروم رہا تھا۔ یا شاید یہ اسی لمحے فائزہ کو اپنانے کا واحد طریقہ تھا۔ لیکن وہ مدافعت کرنے لگی۔ اس پر ہارون نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور گھر کی طرف چلنے لگا۔ وہ اس قدر تیزی سے چل رہا تھا کہ فائزہ کو اس کے پیچھے کم و بیش بھاگنا پڑتا تھا۔ وہ ابھی اس جگہ رہنا چاہتی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہیں بیٹھی رہے اور ہارون کو جانے دے۔ لیکن ہارون کے پیچھے پیچھے وہ بھی گھر پہنچ گئی۔

جمعہ آرام اور گھریلو تقریبات کا دن ہوتا ہے۔ احمد اور عائشہ کے پورے خاندان نے جمعے کے روز ساحل کا رخ کیا۔ مسافروں سے بھری ہوئی بس نے انہیں چندسو میٹر کے فاصلے پر اتار دیا تھا۔ سڑک خوبصورت اور کشادہ تھی۔ اس کے دونوں طرف سنگترے کے درخت لگے تھے۔ جمال نے زمین پر گرے ہوئے چند سنگترے اٹھائے تو احمد کوغصہ آ گیا۔

''لیکن ابا، یہ سنگترے تو زمین پر پڑے تھے۔ ایسے ہی ضائع ہو جاتے۔''

''اگر ہر کوئی ایسا ہی کرنے لگے تو؟ پھر سنگتروں کو کون ضائع ہونے دیتا ہے۔''

اس بحث سے بے نیاز بچوں نے گیند کی طرح سنگترے چھین لیے اور اپنے ان نئے کھلونوں کے ساتھ بھاگنے لگے۔ اس لیے احمد نے بھی سنگتروں کو نظر انداز کر دیا۔ وہ سڑک کے کنارے بنے ہوئے بنگلوں کی تعریف کرنے لگا ''واقعی یہ شاندار بنگلے ہیں۔ یہ ضرور یورپیوں یا سفارت خانوں کے افسروں اور دوسروں نے کرایے پر لے رکھے ہوں گے۔''

باپ کے ساتھ چلتے ہوئے ہارون دل ہی دل میں اس کی برہمی کا لطف لے رہا تھا۔ عرصہ دراز سے وہ ان چیزوں پر برہم نہ ہوا تھا جو اپنی موجودہ صورت سے مختلف ہونی چاہئیں۔ خیر برہمی تو بندے کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ لیکن اسے باپ کی شدید زودحسی پر تعجب ضرور ہوا۔

عائشہ اور فائزہ نے نقاب اوڑھ رکھے تھے اور ان کے ہاتھوں میں ٹوکریاں تھیں۔ بچے خوشی سے اچھلتے کودتے سمندر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سنگترے ابھی تک انہوں نے پکڑ رکھے تھے۔ ثمینہ کے ذمے ان کی دیکھ بھال تھی۔ اس لیے وہ بھی بچوں کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ اس طرح بھاگتے رہے تو وہ پانی تک پہنچ جائیں گے۔ اپنی سانس

MashalBooks.com

کے ساتھ چلتے ہوئے فائزہ کو والدین کے ساتھ ساحل پر چلنے کے دن یاد آئے۔لگتا تھا کہ صدیاں بیت گئی ہیں حالانکہ یہ کل کی بات تھی۔اس کے دل میں خواہش مچلنے لگی کہ کاش وہ اپنے بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ ہوتی جن کہ بارے میں وہ ہمیشہ سوچتی رہتی تھی۔اور کزنوں اور سہیلیوں کے ساتھ ہوتی۔ پہلے ہر شے ہنسنے کھیلنے کا بہانہ بن جایا کرتی تھی۔خیر ابھی چندلحموں بعد وہ تیراکی کر سکے گی۔اسے تیراکی سے اس قدر لگاؤ تھا کہ سمندر میں اترتے ہی وہ اپنے ماضی اوراس کی یادوں کو بھی فراموش کر دے گی۔ پھر بھی وہ پہلے جیسی خوشی محسوس نہ کرتی تھی۔ پریشان سی دکھائی دیتی تھی جیسے زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اس کے لیےممنوع ہوگئی ہوں۔

ساحل پر پہنچتے ہی جمال نے کپڑے اتارے اور سیدھا سمندر میں گھس گیا۔ دونوں چھوٹے بچے بھی اس کے پیچھے ہو لیے وہ تو ہرمعاملے میں بڑے بھائی کےنقش قدم پر چلنا چاہتے تھے۔ عائشہ کو ریت پر چلنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ ویسے بھی اسے ایسی تفریح پسند نہ تھی۔گھر میں رہنے ہی میں اطمینان محسوس کرتی تھی۔صحن میں انجیر کے درخت کے نیچے بیٹھنے میں کتنے مزے ہیں اور یہاں دھوپ میں چلنے سے سانس بھی پھول جاتا ہے۔ پھر بھی وہ بچوں کی خوشی کی خاطر چلی جایا کرتی تھی۔احمد اور ہارون نے جلدی سے خیمہ لگایا، عائشہ نے ٹوکریاں ریت پر رکھیں اور دیکھنے لگی کہ آیا سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ اتنے میں ہارون چیختے چلاتے علی کو لے کر آیا۔اس نے اپنا گیند پانی کی لہروں میں پھینک دیا تھا اور کپڑے اتارے بغیر چھلانگ لگانا چاہتا تھا۔ ماں نے اسے لیا تو وہ ہمیشہ کی طرح چپ ہوگیا۔ثمینہ نفیسہ کو بھی ہاتھ پکڑ کر لے آئی۔

''ارے۔تمہیں خیمہ لگانے میں ہماری مدد کرنی چاہیے تھی!''

ہارون چھوٹے بھائی جمال سے کہہ رہا تھالیکن وہ ہنسا اور سمندر کی طرف واپس بھاگ گیا۔

''یہ بچے بھی خوب ہیں۔'' احمد نے لمبا سانس لیتے ہوئے کہا۔ وہ سمندر کے کنارے ہونے سے خوش تھا۔

اس نے کپڑے اتارے اور گرم ریت پر کاہلی سے بیٹھ گیا۔عائشہ کو اپنے شوہر کے طور طریقے پسند نہ تھے اور وہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار ناک بھوں چڑھا کے کر بھی دیتی تھی۔

MashalBooks.com

''آ جاؤ بی بی۔ بھئی ہم ساحل پر بیٹھے ہیں۔'' احمد نے بیوی کو ناگواری کا اظہار کرتے دیکھا، تو کہنے لگا۔لیکن وہ کبھی ایسی باتیں نہ مانتی۔اس نے تھرموس نکال کر احمد اور ہارون کو کافی کی پیش کش کی۔انہوں نے آمادگی ظاہر کی تو عائشہ نے فائزہ سے کہا کہ وہ انہیں کافی دے دے۔فائزہ نے گرم دھوپ کے مزے لینے والے دونوں کو کافی پہنچادی۔

فائزہ نے ثمینہ کو اشارہ کیا اور دونوں خیمے کے اندر چلی گئیں، چند منٹوں بعد دونوں نہانے کے لباس میں باہر نکلیں۔

عائشہ انہیں دیکھتے ہی غصے سے بوکھلا گئی۔

''ثمینہ تم نے نہانے کا یہ لباس کہاں سے لیا ہے؟ یہ تو کوئی ڈھنگ کا لباس نہیں۔تم دونوں کو یوں ننگا ہونے پر شرم آنی چاہیے۔اور وہ بھی سب کے سامنے۔''

فائزہ زورزور سے ہنسنے لگی۔

''ننگی؟ یہ تو میرا فالتو نہانے کا لباس ہے اور ثمینہ کو پورا بھی آتا ہے۔''

ہارون پسندیدگی کی نظروں سے ماں کو دیکھنے لگا۔

''سنو ماں، ساحل پر تو سب لوگ ایسا ہی لباس پہنتے ہیں۔دیکھو۔''

''بھئی گھر والوں کے سامنے تو یہ ٹھیک ہی ہے۔'' احمد نے کہا۔اسے ایک پیس کا نہانے کا لباس بالکل مناسب لگا۔اس میں کوئی برائی نہ تھی۔

ہارون نے اپنی بیوی کے نازک سے بدن کو پل بھر کے لیے دیکھا۔

''خوش قسمتی سے'' عائشہ بڑبڑائی ''ابھی ایسی عورتیں موجود ہیں جو عزت نفس سے محروم نہیں۔''

اس نے چند نقاب پوش عورتوں کی طرف اشارہ کیا جو اپنے پاؤں پر پانی ڈال رہی تھیں اور ہنس بھی رہی تھیں۔ جمال بھیگا ہوا واپس آیا۔اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔

''پانی کیا مزے کا ہے! ہاں تم بھی آجاؤ۔''

ناراض عائشہ نے احمد کی طرف رخ کیا۔

''ذرا اپنے بیٹے پر دھیان دو۔وہ روز بروز گستاخ ہوتا جارہا ہے۔پڑھائی نے اس کا یہ حال کیا ہے۔پرانے دنوں میں تو کوئی ایسا نہ کرتا تھا۔''

''پرانے دنوں میں۔اب وہ دن نہیں رہے ماں!''

جمال ہنسا اور اس نے شرارت سے ماں کے رخسار کا بوسہ لے لیا۔ ماں کا منہ نمکین پانی سے گیلا ہو گیا۔ اس نے جلدی سے صاف کیا۔ وہ اب بھی بڑبڑا رہی تھی لیکن خوش بھی تھی۔ جمال ثمینہ اور دوسروں کو پیچھے آنے کی دعوت دے کر سمندر کی طرف بھاگ گیا۔

''حالات ایسے ہی رہے تو خدا جانے علی کا کیا حال ہوگا۔''

''بی بی، یہ باتیں سوچنے کے لیے بھی بہت سا وقت پڑا ہے۔''

احمد اور ہارون دونوں ہنسنے لگے۔

فائزہ اور ثمینہ ہولے ہولے سمندر کی طرف بڑھنے لگیں۔ فائزہ نے خوشی کے ساتھ سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ اس نے دیکھا کہ ثمینہ لہروں میں چھینٹے اڑا رہی تھی۔

''اچھا میں تمہیں تیرنا سکھاتی ہوں۔''

لیکن اس وقت فائزہ صرف تیرنا چاہتی تھی، اتنی دور تک جہاں تک ممکن ہو۔ بالآخر اب وہ آزاد تھی، خوش تھی۔

عائشہ پانی کے کنارے آئی اور اپنا نقاب اٹھا کر احتیاط سے پاؤں بھگونے لگی۔ اتنے میں ایک آدمی لہروں میں تیزی سے آگے بڑھا تو عائشہ کے سارے کپڑے چھینٹوں سے بھر گئے۔ وہ خفگی کے عالم میں بڑبڑاتی ہوئی خیمے کی طرف واپس آ گئی۔

''ان میں ضرور شیطان گھسا ہوا ہے۔''

اس پندرہ منٹ تک دھوپ سینکنے کے بعد ہارون نے دیکھا کہ فائزہ سمندر میں دور تیر رہی ہے۔ وہ سمندر کی طرف لپکا اور اس کی طرف تیرنے لگا۔ فائزہ اس کی آواز تو نہ سن سکتی تھی لیکن جب اس نے ساحل کی طرف دیکھا تو ہارون اسے اشارے کر رہا تھا۔ وہ واپس تیرنے لگی۔ جب وہ ہارون اور جمال کے قریب پہنچی تو جمال نے اس پر چھینٹے اڑائے۔ یہ ادا ہارون کو پسند نہ آئی۔

''تم کہیں اور یہ کرتب نہیں دکھا سکتے جمال؟''

''کیوں کیا ہوا؟'' فائزہ نے پوچھا۔

''تم اتنی دور کیوں جا رہی تھیں؟''

''میں تو اس سے بھی دور اور زیادہ وقت تک تیرا کرتی ہوں۔''

''خیر تم کافی تیر چکی ہو اور تمہیں سمندر میں اتنی دور بھی نہیں جانا چاہیے کیا تمہیں

اچھا لگتا ہے کہ مرد تمہارا پیچھا کریں؟''

''مرد میرا پیچھا کریں؟''

''دیکھا نہیں وہ کم بخت تمہارے قریب تیر رہا تھا؟''

''نہیں۔ جب میں تیرتی ہوں تو بس تیرتی ہوں۔''

اس کی تمام خوشی کافور ہوگئی۔ ہارون کی طرف توجہ کیے بغیر وہ بوجھل انداز میں ساحل پر آئی۔ آخر اس خاندان کو کیا ہوگیا ہے۔ وہ ہر شے کو یونہی برباد کر دیتے ہیں۔ اور اس کا شوہر۔ وہ تو اپنے باپ سے بھی کم برداشت والا ہے۔ خیمے میں پہنچ کر فائزہ نے خود کو بڑے سے تولیے میں لپیٹ لیا۔ وہ عائشہ پر توجہ نہ دے رہی تھی جو معاملے کو بھانپ گئی تھی اور سمجھتی تھی کہ اسے واپس لا کر ہارون نے ٹھیک ہی کیا ہے۔ وہ کافی تیر چکی تھی۔ اگر وہ حاملہ ہوئی تو ضائع بھی ہوسکتا ہے۔

''کپڑے پہنو فائزہ ورنہ سردی لگ جائے گی۔ ہارون نے تمہیں واپس بلا کر ٹھیک ہی کیا ہے۔''

''ٹھیک، کیوں؟''

چڑ کر فائزہ نے غصے سے اپنی سانس کو ایک لمحے کے لیے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر وہ باہر افق کی طرف دیکھنے لگی۔ ہارون آزادی سے سمندر میں دور جا کر تیر رہا تھا۔ ثمینہ کو کچھ خبر نہ تھی کہ کیا بات ہوئی ہے۔ اس نے فائزہ کو اشارہ کیا۔ اتنے میں کمال نے چپکے سے ثمینہ کو نیچے گرا دیا اور دونوں ہنسنے لگے۔ فائزہ نے انہیں دیکھا اور پھر ساحل پر بچوں کی طرح کھیلنے والے لوگوں کو تکنے لگی۔

تھوڑی سی تیراکی سے تھک کر احمد نے کھانے کے لیے اچھا سا چلن پیس مانگا۔

جونہی عائشہ نے اسے ران دی وہ شوق سے کھانے لگا۔

''فائزہ تمہیں بھوک لگی ہے؟''

''نہیں، شکریہ۔''

اب اسے کھانا یا تیراکی دونوں اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ بس وہ واپس جانا چاہتی تھی۔ وہ دھوپ میں لیٹ گئی اور سونے کا بہانہ کرنے لگی۔

سمندر میں دور جا کر ہارون تیراکی کر رہا تھا۔

اس رات اپنے کمرے میں عائشہ پریشان دکھائی دیتی تھی اور آہیں بھر رہی تھی۔

''ارے بی بی تم اس طرح آہیں کیوں بھر رہی ہو؟ ساحل پر ہم نے اتنا اچھا دن گزارا ہے۔ دھوپ بھی خوب تھی اور بچے بھی لطف اٹھاتے رہے تھے۔ اب وہ اچھی طرح سوئیں گے۔''

''مجھے بیٹے کی فکر ہے۔ فائزہ اور ہارون میں بن نہیں رہی۔''

''تمہیں یہ خیال کیسے آیا؟''

''یہ تو بالکل ظاہر ہے۔ تم نہ تو کچھ دیکھتے ہو اور نہ ہی عورتوں کو سمجھتے ہو۔''

''اچھا، میں عورتوں کو نہیں سمجھتا؟ بس تم تو ہمیشہ خواہ مخواہ کے مسائل کھڑے کرتی رہتی ہو۔''

''میں نہیں چاہتی کہ وہ فرانس چلا جائے۔ سمجھے؟''

''میں خود بھی نہیں چاہتا۔''

''پھر ہمیں جاننا چاہیے کہ آخر بات کیا ہے۔ تم اس سے بات تو کرو۔''

''اچھا اچھا۔ اب سو جاؤ۔''

''بس یہ عورت ہی اسے یہاں رکھ سکتی تھی۔ لیکن وہ دونوں تو آپس میں اجنبیوں کی طرح ہیں۔ آپس میں کھلتے ہی نہیں۔''

''آرام کرو۔ وہ اسے روکنے کا ڈھنگ سیکھ لے گی۔ بچے کے آنے تک انتظار کرو۔'' احمد ہنسنے لگا۔

''یہ تو ہے! شاید وہ حاملہ ہو۔ تم جانتے ہی ہو کہ اگر عورت کے بچے نہ ہوں۔''

احمد زور سے ہنسا۔

''تم ہوا کے گھوڑے پر سوار نہیں ہو؟''

لیکن عائشہ اب بھی سوگوار تھی۔ احمد دوبارہ کہنے لگا:

''خیر جانے دو ان باتوں کو۔ ابھی وقت تو نہیں گزرا۔ ہماری طرح ہارون کے بھی بچے ہو جائیں گے۔ یہی زندگی ہے۔ خدا کا شکر کرو۔''

دونوں بستر پر دراز ہو گئے۔ احمد نے اپنا دباؤ عائشہ پر ڈالا۔ ساحل پر دن گزارنے کے بعد وہ بڑے اچھے موڈ میں تھا۔

MashalBooks.com

''ہمارا سب سے بڑا بیٹا اپنے باپ کی طرح ہے۔ بالکل۔''

وہ ہنسا اور عائشہ کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ عورتوں کے جو چند مناظر اس نے ساحل پر دیکھے تھے، اب اس کی آنکھوں میں گھومنے لگے۔ لیکن اسے صرف اپنی بیوی عائشہ ہی اچھی لگتی تھی۔ کسی اور بدن سے تو شاید وہ ڈر جائے۔ بے بس ہو جائے۔ عائشہ کا جسم اسے سکون دیتا تھا۔ اس کی قربت سے خواہش جنم لیتی تھی اور تسکین بھی ملتی تھی۔ خدا کرے ہارون کو بھی اپنی بیوی کے جسم سے ایسی ہی مسرت ملے۔

''بیٹی تم آج کل قدرے تھکاوٹ تو محسوس نہیں کر رہیں؟''

فائزہ نے اپنی ساس کی طرف دیکھا۔

''نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

فائزہ آلو چھیلتی رہی۔ وہ دونوں صحن میں انجیر کے درخت کے نیچے بیٹھی آلو چھیل رہی تھیں۔ سامنے ایک بڑی سی پرات رکھی تھی جس میں چھیلے ہوئے اور کٹے ہوئے آلو ڈال رہی تھیں۔

''اچھا۔ تمہاری ماہواری میں تاخیر تو نہیں ہوئی؟''

فائزہ یوں اپنے کام میں مشغول رہی جیسے اس نے کچھ نہ سنا ہو۔ عائشہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''بتاؤ فائزہ۔''

فائزہ نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور اکھڑ پن سے کہنے لگی ''یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔''

عائشہ کو بڑا تعجب ہوا۔ اس نے چاقو پرات میں رکھ دیا اور چیخی ''فائزہ تم میری بالکل عزت نہیں کرتی ہو۔''

اس کے ساتھ ہی وہ رونے لگی۔ فائزہ کے جواب نے اسے واقعی رنجیدہ کر دیا تھا۔ ہارون عین اس وقت اندر داخل ہوا جب وہ آخری جملہ کہہ رہی تھی۔ اس نے اپنی ماں اور بیوی کو ایک دوسرے کو گھورتے دیکھا۔ کوئی بات پوچھے بغیر اس نے فائزہ کو بازو سے پکڑا اور کھینچتا ہوا بیڈ روم کی طرف لے گیا۔

''تمہیں کبھی میری ماں کی بے عزتی نہیں کرنی چاہیے۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ سنا تم نے۔''

MashalBooks.com

عائشہ صحن میں بیٹھی روتی رہی ۔ علی اور نفیسہ جو گھر میں کھیل رہے تھے، انہوں نے اپنے سر دروازے سے باہر نکالے ۔ فائزہ شوہر کی مزاحمت کر رہی تھی ۔ ''تمہیں پتہ ہی نہیں کہ ہوا کیا ہے ۔''

فائزہ کی مزاحمت سے مغلوب ہو کر ہارون نے اسے تھپڑ مارا ۔ فائزہ نے غصے سے اسے دیکھا، ایک دھچکے سے خود کو چھڑایا اور بھاگ گئی ۔ اس نے اپنے بیڈ روم کا دروازہ زور سے بند کر دیا ۔ ماں کے رونے کی آواز سن کر جمال اور ثمینہ اندر آ گئے اور انہوں نے یہ منظر دیکھا ۔ اس وقت احمد اندر داخل ہوا اور صورت حال کے متعلق پوچھنے لگا ۔ جمال ہارون کی طرف بڑھا لیکن اس نے اسے پیچھے دھکیل دیا ۔ اب وہ تیزی سے باہر نکلنے لگا ۔ عائشہ اپنے سب سے بڑے بیٹے کو جانے سے روکنا چاہتی تھی ۔

''تم کہاں جا رہے ہو بیٹا ۔''

لیکن وہ کوئی جواب دیے بغیر باہر نکل گیا ۔ وہ ایک لمحے تک کھڑی ڈیوڑھی میں دیکھتی رہی پھر گھر میں واپس آ گئی ۔ فائزہ اپنے آپ کو کمرے میں بند کر چکی تھی ۔ جمال نے گیند کو زور سے ٹھوکر لگائی جو بچوں نے صحن کے بیچ میں رکھا ہوا تھا ۔ ثمینہ نے چپکے سے فائزہ کے دروازے پر دستک دی ۔ وہ اندر داخل ہوئی تو فائزہ گدے پر بیٹھی رو رہی تھی ۔ ثمینہ اس کی طرف بڑھی اور اس کی چوٹی پر پیار سے بوسہ دیا ۔

''کوئی بات نہیں میری دوست، میری بہن ۔''

فائزہ نے نظریں اٹھا کر ثمینہ کو دیکھا ۔

''اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا اور وہ بغیر وجہ کے ۔ میں یہ بات کبھی برداشت نہیں کر سکتی ۔ کبھی نہیں ۔''

ثمینہ فائزہ کے بالوں کو تھپکتی رہی ۔ پھر اس نے اپنا چہرہ فائزہ کے منہ کے ساتھ لگا دیا ۔

''مت رو میری بہن ۔ مت رو ۔ کیا تم ہارون کے ساتھ خوش نہیں ہو؟ کیوں؟ وہ کمینہ نہیں ہے ۔ نروس ہے مگر کمینہ ہرگز نہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کمینہ نہیں ۔''

''ہم ایک دوسرے کو سمجھتے نہیں، ثمینہ ۔ ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے ۔ نہ ہی ہم ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں ۔ میں ایسی شادی تو نہیں کروانا چاہتی تھی ۔''

''میں تمہیں خوش باش دیکھنا چاہتی ہوں ۔''

MashalBooks.com

''ہم خوش نہیں ہیں اور شاید ہو بھی نہیں سکتے۔''

''ایسی بات نہ کہو۔''

فائزہ اپنی نند پر مسکرا دی جو بہت بے بس لگتی تھی۔ وہ اس کے بالوں اور منہ کو چومنے لگی۔ اس نے سوچا مجھے اپنے والدین کے پاس واپس جانا چاہیے۔ لیکن اس نے یہ بات دل ہی میں رکھی۔

ہارون پریشانی کے عالم میں بازار میں گھوم رہا تھا۔ وہ گھر کے منظر اور بیوی کو مارے جانے والے تھپڑ سے اس قدر برافروختہ ہو رہا تھا کہ اگر وہ پاس ہوتی تو بلاسبب ہی اسے ایک اور تھپڑ مار دیتا۔

اسے والدین پر بھی غصہ آ رہا تھا جنہوں نے اسے شادی پر مجبور کیا۔ زندگی سے بھی اسے گلہ تھا کہ وہ ویسی نہ تھی جیسی وہ چاہتا تھا۔ فائزہ سے بھی وہ نالاں تھا کہ وہ ایسی عورت نہ تھی جیسی وہ چاہتا تھا۔ اور تو اور ہارون خود سے بھی خفا تھا اسی عالم میں وہ مچھلی منڈی کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ اس سے پہلے بھی وہ اپنے لیے کام کی تلاش میں ادھر کا رخ کر چکا تھا۔

''اوہ، ہارون آ ؤ۔ صبح بخیر۔ مجھے افسوس ہے۔ بڑا افسوس ہے۔ میں ہر طرح تمہارے والد کو خوش کرنا چاہتا تھا لیکن سچ مانو اس وقت تو یہ محال ہے۔ ہاں شاید اگلے ماہ......''

''خیر میں پھر آ ؤں گا شکریہ۔''

منڈی کے ناظم نے گرم جوشی سے ہارون کے ساتھ ہاتھ ملایا اور مسکراتا ہوا ایسے آدمی کی طرح چل دیا جو بہت جلدی میں ہو۔ ہارون آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اس نے پوری منڈی کو پار کیا۔ دکانیں تازہ مچھلی سے بھری پڑی تھیں۔ ایک آدمی نے اسے تھوڑی سی مچھلی پیش کی لیکن وہ ہچکچایا۔ اگر اس نے مچھلی خریدی تو پھر اسے فوراً ہی گھر واپس جانا ہوگا۔ جب کہ اس کا دل سمندر کے کنارے سیر کرنے کو چاہتا تھا۔ وہ دوبارہ ایک مچھلی کے سامنے کھڑا ہو گیا جو ابھی تک زندہ تھی اور پانی سے باہر ہونے کی اذیت سہہ رہی تھی۔ ہارون نے سگریٹ سلگایا اور پھر چلنے لگا۔ خیر اسے بھی یہاں کام کرنا زیادہ پسند نہ تھا۔ سارا دن مچھلیوں کی بو میں بیٹھے رہنا۔ وہ خود ہی اپنے ردعمل پر مسکرا دیا۔ جیسے پیرس میں اسے

بہت اچھی خوشبوئیں ملتی ہوں۔ مچھلی منڈی زندہ باد۔ سورج زندہ باد۔ سمندر زندہ باد۔

چند قدموں کے فاصلے پر چالیس کے لگ بھگ کا ایک شخص ریت پر بکھرے ہوئے کاغذ اور کوڑا کرکٹ اکٹھا کر رہا تھا۔ تھوڑے سے فاصلے پر اس نے سوڈے اور بیئر کی خالی بوتلوں کا ڈھیر لگا رکھا تھا۔ اس نے اپنی نوکدار دھات کی چھڑی کے ساتھ کاغذ اٹھایا اور خوش مزاجی کے انداز میں ہارون کی طرف آنے لگا۔ وہ گپ شپ لگانے کے موڈ میں تھا اور ہارون کا انداز بھی دوستانہ تھا۔

''تم کام کی تلاش میں مچھلی منڈی گئے تھے؟''

حیران ہو کر ہارون نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں نے تمہیں وہاں دیکھا تھا۔ وہاں تو کوئی کام نہیں ہے۔ اس نے تمہیں دوبارہ آنے کو کہا ہے؟ سب سے وہ یہی کہتا ہے۔ لیکن دوبارہ آنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی کام ہوا بھی تو اس کے دوستوں کو ہی ملے گا۔ یہاں کا رواج یہی ہے۔ میں یہاں کام کرتا ہوں۔ سٹی ہال والے مجھے تنخواہ دیتے ہیں۔ میں ساحل کی صفائی کرتا ہوں۔ سہ پہر کو پھلی اور زیتون بیچتا ہوں۔ بس یہاں تو یہی کچھ ہے۔ رہا کام تو اگر تم صحیح جگہوں پر تلاش کرو تو شاید کچھ مل ہی جائے۔ لیکن تمہیں سب کچھ کرنے پر تیار رہنا ہوگا۔ میں نے چرواہوں کا کام کیا ہے۔ جوتے چمکائے ہیں۔ مالی بھی رہا ہوں۔ میں سب کچھ کرنا جانتا ہوں۔ یہاں تک کہ مجھے بجلی کا کام بھی آتا ہے۔''

مہربان نظروں سے ہارون نے اسے دیکھا۔ اس آدمی کو کسی نہ کسی سے بات کرنے کی خواہش تھی، چاہے وہ اجنبی ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے ہارون اس کی باتیں سنتا رہا۔ کبھی کبھار اس کا جی بھی اجنبیوں سے بولنے کو چاہتا تھا تاکہ وہ دل کی بات کہہ کر اپنا بوجھ ہلکا کر سکے۔ لیکن اب وہ دل کی بات کہنے اور راز دار بنانے کی عادت فراموش کر چکا تھا۔

''ہاں ہاں یہ تو ہے۔ مصیبتوں ہی نے مجھے زندگی میں سب کچھ سکھایا ہے۔ سب کچھ۔''

اب وہ دوبارہ تندہی سے کاغذ چننے لگا تھا۔

''یہ کام میرے لیے مشکل ہے لیکن بچوں کی خاطر کرنا پڑتا ہے۔ ابھی تک چار بچے سکول جاتے ہیں۔ خدا نہ کرے ان کا مقدر بھی میرے جیسا ہو۔ شاید ان میں سے کوئی کبھی مالدار بن جائے۔''

وہ ہنسا اور پھر اس کا چہرہ مدھم پڑ گیا۔

''شاید تم نہ مانو، لیکن پچھلے مہینے تو میں اپنی بیوی کو کچھ نہیں بھیج سکا تھا۔ بس بہت ہی برا حال ہے۔ وہ گاؤں میں رہتی ہے۔ تم بھی شادی شدہ ہو؟''

''ہاں''

''بچے بھی ہیں؟''

''ابھی نہیں۔''

''خدا نے چاہا تو ہوں گے۔''

وہ کاغذ سمیٹتا ہوا، اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا پرے ہٹ گیا۔

''مجھے اس کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ شاید وہ بھی اپنی ماں کی طرح طلاق مانگ رہی ہو۔ بدبخت عورت۔''

ہارون اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔ پھر وہ مڑا اور دوستانہ انداز میں ہاتھ لہرایا۔ ''خدا تمہارا نگہبان ہو۔''

ہارون مسکرایا اور اپنا ہاتھ سینے پر رکھ دیا۔ وہ مسلسل اپنے کام میں مصروف تھا۔ شاید باتوں کے ذریعے دل کا بوجھ کم کرنے کے بعد اب وہ خوش تھا۔ ہارون آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

کبھی کبھی جب وہ پردیس سے گھر آتا تھا تو ویسے ہی آہستہ آہستہ چلنے لگتا تھا جیسے کبھی اپنے باپ کے پیچھے چلا کرتا تھا۔ مدھم چال جو روح اور جسم دونوں کو سکون دیتی یہاں تک کہ پریشانیاں کم ہو جاتیں۔ کبھی کبھی ختم ہی ہو جاتیں۔

تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک کیفے کے چبوترے پر بیٹھ گیا۔ بیئر کا آرڈر دیا اور سگریٹ سلگاتے ہوئے گزرتے ہوئے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ جواں میاں بیوی اور بچہ جو پورے شوق سے رنگ برنگے گیند کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ بیوی فائزہ سے زیادہ بڑی نہ تھی۔ اس نے اپنے شوہر کا بازو تھام رکھا تھا اور بے پردہ تھی۔ اسے فرانس کی یادیں پھر آنے لگیں یا شاید ماضی حال کے ساتھ گڈمڈ ہو گیا تھا۔ پیرس میں بیتے ہوئے دنوں کی یادوں کی تال پر وہ گرد و پیش کی اشیا پر غور کرنے لگا۔ بیک وقت وہ یہاں بھی تھا اور وہاں بھی۔ اچانک وہ ایک دوست کے ساتھ پیلس کلیچے کی گنجان گلیوں میں گھومنے لگا۔

''بھائی اب تو میں پیرس اور ان گلیوں کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ یہاں میں خوش

نہیں ہوں۔لیکن خوشی وطن واپس جا کر بھی نہ ملے گی۔اس بات کو سمجھنے کی خوشش کرو۔بس میں تو اس جگہ کا عادی ہو گیا ہوں، جیسے تمبا کو کا۔

دو ڈبیاں روزانہ میرے بھائی۔لوگ کہتے ہیں کہ اس سے کینسر ہو جاتا ہے۔ لیکن کسی نہ کسی طرح تو مرنا ہی ہے۔جو تمبا کو نہیں پیتے آخر وہ بھی تو مرتے ہی ہیں۔''

ہارون حسب معمول خاموش رہا تھا۔

''تمہیں زندگی میں کیا پسند ہے؟'' دوست نے پوچھا تھا اور ہارون نے یوں جواب دیا تھا کہ:

''کاش۔ مجھے معلوم ہوتا۔کسی روز کوئی بات پسند ہوتی ہے دوسرے روز کوئی اور شے۔یا کچھ بھی نہیں۔''

''میرے بھائی تم نے ضرور کبھی کوئی شے بڑی شدت سے چاہی ہوگی اور ناکام رہے ہوگے۔یہ تو اس کا نتیجہ ہے۔''

ہارون اس بات چیت کو کبھی نہ بھولا تھا۔اب پھر وہ یاد آ رہی تھی اور متعلقہ خیالات اور تصورات بھی ذہن میں گردش کرنے لگے تھے۔آج اس کا تعلق ایک ایسے دوست سے تھا جو زیر تعمیر عمارت میں کام کرتے ہوئے زخمی ہو گیا تھا۔کیوں؟ ہاں۔کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اسے کسی شے کی تلاش ہے۔لیکن زندگی نے اور ہی فیصلہ کر دیا تھا۔ہارون کو فائزہ، طمانچے اور اس کی غصیلی نظریں یاد آنے لگیں۔اس نے سوچا کہ آخر اس نے ماں کو کیا کہا ہوگا۔آہ۔یہ عورتیں۔رات کو وہ ضرور پوچھے گا۔اس نے ایک پردہ دار عورت کو دیکھا جو دو بچوں کے ہاتھ پکڑے بوجھل قدموں سے چل رہی تھی جبکہ ایک اور عورت اونچی ایڑی کے جوتوں میں ترغیب انگیز انداز میں چل رہی تھی۔اسے ماریا کی یاد آئی جسے وہ پیرس میں دو سال تک ملتا رہا تھا۔جب وہ پہلی بار اس سے ملا تھا تو وہ سیلز گرل تھی۔اس نے کچھ عرصہ پہلے ہی اپنا گھر بار چھوڑا تھا۔وہ بیک وقت اس کو مسکراتا ہوا اور غصے میں دیکھ سکتا تھا۔ان کا تعلق طوفان انگیز رہا تھا جیسے سورج، سیاہ بادل اور گرج چمک۔

''تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں تو یہاں سے نکل جاؤ۔نکل جاؤ۔''

اگر وہ اس قدر بدگماں نہ ہوتا تو شاید وہ اسے نہ چھوڑتی۔لیکن وہ حسد اور بدگمانیوں پر غالب نہ آ سکا تھا۔

MashalBooks.com

''تم سب بس اسی قابل ہو۔عورت کو کتے کی طرح قابو میں رکھنا چاہتے ہو۔ جیسے وہ تمہاری ملکیت ہو۔اس کے گلے میں پٹہ کیوں نہیں ڈال دیتے؟''

ہارون کے خیال میں مسئلہ ملکیت کا نہیں عزت کا تھا۔ ہاں عزت کا۔ بندے کی عزت تو رہنی چاہیے۔ یہ بات اس نے ماریا سے بھی کہی تھی۔اس کا جواب صاف تھا۔

''صرف تمہیں ہی عزت کی ضرورت نہیں۔ مجھے بھی تو ہے۔''

ہارون جانتا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ہم سب کو عزت کی ضرورت ہے۔اس نے سوچا۔لیکن پھر یہ معاملہ کیونکر طے ہوا؟ انہوں نے ایک دوسرے سے ایسی باتیں کہیں جنہوں نے علیحدگی پیدا کر دی۔ایسی علیحدگی جو دونوں میں سے کسی کو بھی پسند نہ تھی۔ ہارون نے مزید بیئر کا آرڈر دیا اور ایک اور سگریٹ سلگانے لگا۔

نیم تاریکی میں فائزہ بستر پر بیٹھی تھی۔ دوسرے کمرے سے شور کی آوازیں آ رہی تھیں مگر اس نے کوئی توجہ نہ دی۔اس کے دل و دماغ میں ایسے اذیت ناک سوال اٹھ رہے تھے جن کا کوئی جواب موجود نہ تھا۔ حال ایسی مضبوط دیوار کی طرح تھا جسے وہ گرا نہ سکتی تھی۔ اس لیے وہ دن کے سپنوں میں کھو گئی۔اسے وہ شام یاد آئی جب وہ سونے کے بجائے اپنی بہن سے باتیں کرتی رہی تھی۔

''فائزہ- فائزہ آج رات روحیں بھی سن رہی ہیں؟''

''کیسی روحیں؟''

''رات کی روحیں جو زندگی میں مسرتوں کا پیغام لاتی ہیں کیونکہ آج گرما کا پہلا دن ہے۔آؤ ہم گنتی کریں۔آخری نمبر جس کا ہوگا اسے بہترین شوہر ملے گا۔''

انہوں نے گنا اور ہنسنے لگیں۔

ان کی ماں اور دادی اندر داخل ہوئیں۔

''دیکھو کیسے فرشتوں کی طرح سو رہی ہیں۔''

دبے پاؤں وہ باہر نکل گئیں۔ دروازہ دوبارہ بند ہوتے ہی کھیل دوبارہ شروع ہو گیا۔ فائزہ جیت گئی تھی۔اسے بہترین شوہر ملے گا۔ ہارون بہترین شوہر۔ یہ معصوم کھیل کتنے پرانے ہو گئے تھے۔ پھر بھی اس کے دل کے کتنے قریب تھے۔ فائزہ اپنی ماں کا شفقت بھرا چہرہ اور دو بہنوں اور چھوٹے بھائی کے ہنستے مسکراتے چہرے اب بھی دیکھ سکتی

تھی۔ ایسی محبتیں کیوں اگر انہوں نے اچانک چھن جانا تھا۔ اس کے دل میں والدین سے ملنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس لیے اسے ملنے نہیں آتے کہ وہ شہر کے دوسرے کونے میں رہتے ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ اسے اپنے نئے گھر اور نئے خاندان کی عادت ڈالنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ نئے ماحول سے ہم آہنگ نہ ہو رہی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ وہ کبھی نہ ہو سکے گی۔ اس نے ایک ایسے گھر کا تصور کیا جو مکمل طور پر اس کا اور اس کے شوہر کا تھا اور ہارون کی شخصیت بھی قدرے مختلف تھی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔ دونوں نے خوب باتیں کیں۔ وہ اس کے سینے پرونے کے کام میں دلچسپی لے رہا تھا۔ اس نے بہت سا کام کرنا تھا۔ پڑوسنیں اس کے گھر آئیں۔ ان کے بچے ادھر ادھر کھل رہے تھے۔ وہ بازار میں نقاب کے بغیر جاتی۔ خرید وفروخت کرتی۔ ایک بک سٹور سے اس نے ایک کتاب اور ایک فیشن کیٹلاگ خریدی۔ اس نے اور ہارون نے ایک دوسرے کو چوما، باتیں کیں اور خوب ہنسے۔

بے چینی کے عالم میں جمال صحن میں ہارون کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ہارون سے فائزہ اور آج کے معاملے کے متعلق گفتگو کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ فیصلہ کرنے کے بعد سے وہ اپنی ہمت بندھا تا رہا تھا۔ اس نے اپنے جملوں پر غور کیا پھر بھی وہ مطمئن نہ تھا۔ اس کے لیے بڑے بھائی سے بات کرنا آسان نہ تھا اور اسے معلوم تھا کہ اس کا فیصلہ کس قدر جسارت انگیز تھا۔ اندھیرا اچھیل چکا تھا۔ ہارون داخل ہوا تو جمال تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''تمہارا انتظار کر رہا تھا۔''

''میرا انتظار؟ کیوں۔ کیا بات ہے؟''

''میں۔ میں فائزہ اور تمہارے اور سہ پہر کے واقعہ کے متعلق کچھ کہنا چاہتا تھا۔''

پہلے تو ہارون پریشان ہوا پھر اچانک اسے چھوٹے بھائی کی حماقت پر شدید غصہ آیا اور وہ اسے دھکا دے کر کہنے لگا۔

''تمہیں اس کا کیا حق ہے۔ اپنے کام سے کام رکھو۔ جاؤ۔ سو جاؤ۔''

مشکل سے ہارون نے اپنے غصے پر قابو پایا۔ وہ تھپڑ مارنے ہی کو تھا۔ جمال بے حس وحرکت صحن کے وسط میں کھڑا رہا۔ ہاں اس کے بڑے بھائی سے معاملہ طے کرنا واقعی سہل نہ تھا۔ وہ دوست بن کر ہر بات کہنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ محال تھا۔ مگر کیوں؟

بے ڈھنگے پن سے ہارون کمرے میں داخل ہوا۔ جمال کے قصے پر وہ ابھی تک اشتعال میں تھا۔ جونہی ہارون نے بتی جلائی، فائزہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''تم اس اندھیرے میں کیا کر رہی ہو؟''

''تمہارا انتظار کر رہی تھی۔''

ہارون نے اپنی جیکٹ لٹکا دی اور اسے دیکھے بغیر کہنے لگا:

''تم میری ماں کی توہین کیوں کرتی ہو؟''

''میں نے تو کوئی بات نہیں کی۔''

فائزہ کے آواز بے نیازی کی حد تک پرسکون تھی۔

''اچھا تو تمہارا مطلب ہے کہ میری ماں جھوٹ بولتی ہے۔''

''مجھے غصہ اس وقت آیا تھا جب اس نے ایسی بات پوچھی جو میں اسے بتا نہ سکتی تھی۔''

''اس نے کیا پوچھا جو تم نہ بتا سکتی تھیں۔''

ہارون حیرت میں ڈوبا ہوا فائزہ کے روبرو تھا۔ لیکن وہ اس کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی۔ وہ آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ اس کے لمبے بال نیلے لباس پر گرے ہوئے تھے۔ ابھی تک وہ خاموش تھی۔

''تم اسے کیا بتا نہیں سکتی تھیں، فائزہ؟''

''اس نے پوچھا تھا کہ آیا میرے ایام درست ہیں۔''

ہارون تعجب سے آگے بڑھا۔ اس کا چہرہ اٹھایا اور یوں اسے اپنی طرف دیکھنے پر مجبور کیا۔

''اچھا تو تمہیں ماہواری نہیں آ رہی؟''

ہارون کے ہاتھ سے پیچھے ہٹتے ہوئے فائزہ نے پھر اپنا سر نیچے کر لیا۔

''فائزہ، کل تم میری ماں کو بتاؤ گی کہ تم حاملہ ہو۔ اور معافی بھی مانگو گی۔''

اب وہ ملائمت سے بول رہا تھا۔ تعجب سے فائزہ نے اسے دیکھا۔ اس کا لہجہ جذباتی تھا۔ لیکن وہ یہی کہہ سکا تھا کہ تم معافی مانگو گی۔ لمحہ بھر کے لیے اس کا سر چکرایا۔ پھر وہ سنبھلی اور کچھ کہے بغیر کپڑے بدلنے لگی۔

اس خبر سے ہارون بے حد متاثر ہوا تھا، مگر اس نے اپنے جذبات پر قابو رکھا اس

MashalBooks.com

کی بیوی حاملہ تھی۔ اب وہ باپ بنے گا۔ اس نے شادی کا بندھن قبول نہیں کیا تھا۔ نہ ہی اس نے باپ کے فرائض ادا کرنے کے لیے خود کو تیار کیا تھا۔ وہ روح کی پوری گہرائیوں سے آنے والے بچے کو چاہتا تھا لیکن اتنی ہی قوت کے ساتھ لاشعوری طور پر اسے مسترد بھی کرتا تھا۔ وہ سگریٹ پر سگریٹ پیتا رہا۔ نینداس سے کوسوں دور تھی اور بیوی کو چھونے کے قابل بھی نہ تھا۔

''تم اسے بتاؤ گی، کہ تم حاملہ ہو اور معافی بھی مانگو گی۔ تم اسے بتاؤ گی، تم معافی مانگو گی۔ میں ماں بننے والی ہوں۔ میں ماں بننے والی ہوں اور ہارون اس کا باپ ہوگا۔''

آخر وہ سمجھتا کیوں نہیں کہ خود اس نے بھی پہلے اس تصور کو ہضم کرنا ہے؟

آخر وہ سمجھتا کیوں نہیں پہلے انہیں یہ بات ایک دوسرے کو بتانے کے قابل ہونا چاہئے تھا؟

ہمارے ہاں بچہ پیدا ہونے والا ہے۔

میں ماں بننے والی ہوں۔

روح اور بدن کے زخم ابھی تازہ ہیں۔

فائزہ رونے لگی۔ اس کا جی متلانے لگا تھا۔

والدین کے محبت آمیز دباؤ کے تحت ہارون نے کام تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ہر طرف ناکامی کا منہ دیکھنے کے بعد بالآخر اس نے یورپ واپس جانے کا ارادہ کرلیا۔ اس نے الجیرس کا کونہ کونہ چھان مارا تھا۔ اب وہ اس شہر کو پسند کرنے لگا تھا اور اس میں رہنا چاہتا تھا۔ الجیرس کی دھوپ، اس کی رونقیں، اس کی چوغے پہنے اور بچوں کے غول میں پھنسی ہوئی عورتیں، اس کا جوش و ولولہ اور اس کی زندگی پیرس سے کہیں زیادہ انانی، زیادہ پر جوش اور زیادہ خوش باش تھی۔ پھر وطن میں ہونے کا احساس اور اجنبیوں کا نشانہ بننے کی کوفت سے نجات گویا سونے پر سہاگہ تھی۔ ہاں اس کے بال بچوں کو یہیں، اس شہر میں رہنا چاہیے اور کہیں نہیں۔ فرانس سے اپنی واپسی کے ابتدائی دنوں کے مقابلے میں اب الجیرس سے بڑھتے ہوئے لگاؤ کی بنا پر اس نے کام تلاش کرنے کی اور بھی زیادہ کوشش کی۔ لیکن ناکامی اس کا مقدر بن چکی تھی۔

کام تلاش کرنے کی تگ و دو سے تھک ہار کر ایک روز وہ قصباہ کے علاقے میں جا نکلا۔ سیڑھیوں والی ایک گلی میں بچے چارپائیوں سے چھلانگیں لگا رہے تھے۔ انہوں نے ہارون کو دیکھا تو ہنستے ہوئے اس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ ایک دہلیز پر بیٹھا ہوا بوڑھا آدمی یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔

''ارے بھائی، تم تو اپنے وطن ہی میں سیاح بن گئے ہو، کوئی شے تلاش کر رہے ہو؟ شاید میں تمہاری کچھ مدد کرسکوں۔''

''نہیں شکریہ۔ میں کچھ تلاش نہیں کر رہا ہوں۔''

''بھائی تم تو ہمیشہ کچھ ڈھونڈتے رہتے ہو۔''

ہارون بوڑھے پر مسکرایا اور آگے بڑھ گیا۔ بوڑھے نے سر کو ہلایا۔

MashalBooks.com

''اپنے ہی وطن میں سیاح۔'' ہارون پیچھے مڑا۔ بوڑھا اب اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔''میرے بھائی تم تو ہمیشہ کچھ ڈھونڈتے رہتے ہو۔'' ہاں وہ کچھ تلاش کر رہا تھا سب سے پہلے تو کام جو اسے ملتا نہ تھا۔ کام، یہاں۔ اسی شہر میں۔ وہ اور کیا تلاش کر رہا تھا؟
''میرے بھائی تم تو ہمیشہ کچھ ڈھونڈتے رہتے ہو۔''

تھوڑے فاصلے پر دولڑکے جھگڑ رہے تھے اور ایک دوسرے کا سر توڑنے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ دوسرے انہیں روک رہے تھے۔ ہاں فرانس کی گلیوں میں بھی لوگ اسی طرح لڑتے ہیں۔ ہر جگہ یہی تماشہ ہوتا ہے۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو دنگا فساد پسند ہے؟ یا بات یہ ہے کہ وہ ایسی چیز کے متلاشی ہیں جو انہیں نہیں ملی؟

ہارون ہنستے بستے اور بیک وقت امیر وغریب شہر میں مٹرگشت کرتا رہا پرہجوم عمارتیں جن کی اکثر کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے اور دیواروں میں دراڑیں تھیں۔ کسی نے ان عمارتوں کی دیکھ بھال پر توجہ نہ دی تھی۔ ان میں سے بعض پر جنگ آزادی کے دنوں کے پرانے کتبے نصب تھے جن پر بے ہنگم طریقے سے رنگ کرایا گیا تھا۔لیکن ان کی جھلک اب بھی دیکھی جا سکتی تھی۔ شہر میں جا بجا تعمیراتی کام جاری تھا اور ایسی کھلی جگہیں بھی بہت سی تھیں جن پر آئندہ عمارتیں بنتیں۔ یہ شہر کام کرنے والوں سے بھرپور تھا اور ان سے بھی جو کچھ نہیں کرتے اور محض دھکم پیل میں زندہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دیکھو، دیکھو۔ ایسی گھڑی، جسے باندھ کر آپ تیر سکتے ہیں، مکے مار سکتے ہیں۔ آپ اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ٹرانسفر ریڈیو۔

اور وہ بھیک مانگتے ہوئے بچے۔ ہمارے ملک میں ایسے بچے نہیں ہونے چاہئیں اور بڑے بھی نہیں جو مانگنے پر مجبور ہوں۔ اب یہ سب کچھ ختم ہو جانا چاہیے۔ جو ہے اور جو نہیں ہونا چاہیے کے درمیان کتنا فاصلہ ہے۔ بھکاری تو چاروں طرف ہیں۔

''انہیں کچھ نہ دو۔ اس طرح تو برائی زور پکڑتی ہے۔'' ایک روز اس نے پیرس کی سب وے میں ایک جپسی بچے کو چند پیسے دیے تھے اور اردگرد کے لوگ اسے گھورنے لگے تھے۔

ہارون ان تمام مقامات پر گیا جن کے پتے مختلف لوگوں نے دیے تھے۔ ہر جگہ اسے کاغذات پر کرنے، مزید کاغذات پر کرنے کو کہا گیا تھا۔ وہ لکھنا نہیں جانتا تھا۔ بیوی کو

ہی ساتھ لے آتا جولکھ سکتی تھی ،لیکن اس نے ایسا کرنا مناسب نہ سمجھا۔لہذا ابا سے ہر بارکسی کی نوازش کی ضرورت پڑتی تھی۔''ہم تمہیں اطلاع دے دیں گے۔لیکن کسی بات کی جلد توقع نہ کرنا۔''ہمیشہ ایک ہی جواب۔''کسی بات کی توقع نہ کرنا۔''

بندرگاہ پر بھی اس نے قسمت آزمائی۔ بے سود۔ ہمیشہ بے سود۔لیکن بندرگاہ کس قدر شاندار تھی!اسے تو گھنٹوں دیکھا جا سکتا تھا۔وہ ایک کیفے کی روش میں بیٹھ گیا۔وہ بیٹھ جاتا یا کام تلاش کرتا رہتا۔نتیجہ تو ایک سا ہی ہوتا۔اس نے گودیوں کی قطار کو دیکھا۔ دور کشتیاں سامان اتارنے کے انتظار میں کھڑی تھیں۔لوگ کہتے ہیں کہ اس ملک کو ہر روز دس لاکھ کا نقصان ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے تو واقعی کس قدر زیادہ نقصان ہوتا ہے۔

چوراہے کے ایک کونے میں بہت سے مرد اور عورتیں ٹیکسیوں کے منتظر تھے۔ لیکن وہ تھیں کہ رکتی دکھائی نہ دیتی تھیں۔ ہارون دلچسپی سے ان لوگوں کو دیکھنے لگا جو آوازیں دے رہے تھے، چیخ رہے تھے، دھکے دے رہے تھے۔ایسے بھی تھے جو ٹیکسی سے ملتی جلتی ہر پہلی گاڑی کے آگے بھاگتے تھے تاکہ وہ دوسروں سے پہلے پہنچ جائیں۔بسوں پر دھاوا بول دیا گیا تھا۔ وہ اس قدر کھچا کھچ بھری تھیں کہ اب ان میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی تھی۔ ہاں واقعی یہ تو پیرس سے بھی بری حالت ہے۔ چند بوڑھے اس ساری کشاکش سے بے نیاز سایے کے نیچے اونگھ رہے تھے۔عورتیں بے پروائی سے گزر رہی تھیں۔بعض جلدی میں تھیں۔ بچے بھاگ رہے تھے، چیخ رہے تھے اور خوش ہو رہے تھے۔کیفے میں اندر اور باہر ہر جگہ صرف مرد تھے۔لیکن ہارون نے عورتوں کی عدم موجودگی پر کوئی توجہ نہ دی۔ البتہ اس نے چالیس کے لگ بھگ کی ایک خاتون کو ضرور دیکھا جو ایک طرف کھڑی کافی پی رہی تھی جو اس کا بیٹا یا پوتا اندر سے لایا تھا۔ بچہ خالی کپ کو کاؤنٹر پر واپس لے جانے کا انتظار کر رہا تھا۔اتنے میں ایک یورپی عورت مقامی لوگوں کے رواج کو نظر انداز کرتی ہوئی کیفے میں داخل ہوئی اور مردوں کے درمیان ایک میز پر بیٹھ کر اس نے کافی کا آرڈر دیا۔ پھر اس نے سگریٹ سلگایا اور بندرگاہ کو تفریحی نظروں سے دیکھنے لگی۔

روش پر بیٹھے ہوئے ہارون کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔ پانی اور پتھر سے منعکس ہونے والی روشنی نے اس کے خیالات کو سکون عطا کر دیا تھا۔وہ اپنے دکھ بھول چکا تھا۔ہارون دن کے خوابوں میں کھویا ہوا بھی نہیں تھا۔ جب سے نانترے میں اس کے دوست خالد کا انتقال

ہوا تھا اس نے دن کے خوابوں میں پناہ لینی چھوڑ دی تھی۔ خالد تو دن کے خوابوں کا رسیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ڈھیر ساری دولت کما کر وطن واپس آنے کے خواب دیکھا کرتا تھا جس سے وہ اپنا کاروبار شروع کرے گا۔ گھر خریدے گا، شادی رچائے گا اور بچے پالے گا۔ اگر محنت مزدوری سے یہ سب کچھ نہیں ہوسکتا تو پھر جوئے میں کیوں نہ قسمت آزمائی جائے۔ خالد کو اس کا بہت یقین تھا۔ لیکن قسمت کا لکھا کچھ اور تھا۔ یا شاید......موت نے...... ہارون اکثر اوقات موت کے بارے میں سوچا کرتا تھا۔ خالد کی موت کے بعد۔ لیکن اس وقت وہ کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ موت، زندگی، ہونے والا بچہ، فائزہ، یہاں تک کہ اپنے ہی ملک میں بے روزگار ہونے کے بارے میں بھی نہیں۔ نہ ہی اس بارے میں کہ وہ فرانس میں تارک الوطن محنت کش تھا۔ اسے یہ خیال بھی نہیں آ رہا تھا کہ کیسے اسے ہمیشہ ایک ہی سماجی حیثیت کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے حالانکہ وہ ایک بالکل مختلف وجود ہے اور تمام انسانوں کی طرح اسے بھی کام میں تحویل نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی بے روزگاری میں یا کاغذات کے پُر کرنے میں یا اس کے متعلق ایسی باتوں کے استفسار میں جو وہ جانتا ہی نہیں۔ جو کچھ وہ جانتا ہے وہ کبھی پوچھا ہی نہیں گیا۔ اس لمحے وہ بس سگریٹ پی رہا تھا، ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور ان تمام باتوں کو فراموش کر رہا تھا جو چین کے چند لمحے حاصل کرنے کی خاطر بھولنی ضروری ہیں۔ ایسے لمحے جو زیادہ جاندار اور انسانی ہوتے ہیں۔

''دیکھو ابا۔ ان دو مہینوں میں میں ہر جگہ کی خاک چھان چکا ہوں!''

''کوئی بات نہیں بیٹا۔ حوصلہ نہ ہارو۔ آخر جلدی کیا ہے۔ کوئی نہ کوئی کام تو مل ہی جائے گا۔''

ہارون اور اس کا باپ دونوں بڑی بیٹھک میں کافی پی رہے تھے۔ ریڈیو سے ہلکا پھلکا ماڈرن طرز کا میوزک چل رہا تھا۔ کمرے میں صرف دو ہی بازو والی کرسیاں تھیں، جن پر وہ بیٹھے تھے۔ کرسیوں کی بوسیدگی کو چھپانے کے لیے ہاتھ کے بنے ہوئے پوشش ان کے اوپر ڈال دیے گئے تھے۔

''ہمت رکھو۔ تھوڑی کوشش اور کر دیکھو۔''

''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں تین ماہ کے لیے آؤں گا تمہاری خواہش کے مطابق شادی کروں گا اور پھر فرانس واپس چلا جاؤں گا۔ جہاں میرا روزگار ہے۔''

MashalBooks.com

''اچھا تمہیں یقین ہے کہ واپس جانے پر نوکری تمہیں دوبارہ مل جائے گی؟''

''معاہدہ تو یہی تھا۔''

''مگر تمہارا مقام یہاں ہے بیٹا۔ اپنی بیوی کے ساتھ، ہمارے ساتھ۔ خاص طور پر اب جب کہ تم باپ بننے والے ہو۔ تمہاری یہاں موجودگی سے میں بے حد خوش ہوں۔ تمہیں کام بھی مل جائے گا۔ ہمارے ملک میں ہر شے بدل رہی ہے اور تم یہ دیکھ ہی چکے ہو۔ پھر اس دوران میں تمہاری مدد بھی تو کرسکتا ہوں۔ بے شک ہم امیر نہیں ہیں لیکن تھوڑی سی قربانی کرنا اور مل جل کر رہنا کہیں بہتر ہے۔ نہیں؟ تم جانتے ہو یہاں ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔''

والد کی آواز میں جذبے کی گرمی تھی۔ ہارون اس پر مسکرانے لگا۔

''ابا اگر کام مجھے ملتا تو میں ضرور یہیں رہتا۔ لیکن کوئی کام ملتا ہی نہیں۔ اس لیے مجھے فرانس واپس ضرور جانا چاہیے۔ صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ واپس آنے پر مجھے میری نوکری دے دے گا۔ یہاں میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ جب یہاں کام ہوا تو میں لوٹ آؤں گا۔ اس دوران میں تمہیں پہلے کی طرح وہاں سے پیسے بھیجتا رہوں گا۔ یہی مناسب ہے۔ فائزہ یہاں تمہارے پاس رہے گی اور بچہ بھی یہیں پیدا ہوگا۔''

لگتا تھا کہ جیسے وہ والدین کو بچے کا تحفہ پیش کر رہا ہو۔

ایک طویل لمحے کے لیے خیالوں میں کھویا ہوا احمد خاموش رہا۔ وہ ناراض سا دکھائی دیتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر ہمت کی۔

''بیٹا میں نے تمہیں بتایا نہیں، لیکن تمہارے لیے میں بہت سی درخواستیں دیتا رہا ہوں۔ لیکن بے سود۔ تم جانتے ہی ہو کہ میں نے اپنے وطن کی آزادی کے لیے جنگ کی تھی۔ لیکن دوسرے لوگ جنہوں نے کچھ نہ کیا اور دوسرے ملکوں میں جا کر چھپے رہے، اب وہ راج کر رہے ہیں۔ کیوں؟ اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ مناسب نہیں ہے بیٹا، قطعاً مناسب نہیں ہے۔ جو راج کر رہے ہیں اب وہ مجھے تمہارے لیے ایک نوکری بھی نہ دیں گے۔ حالانکہ میں نے پہلے کچھ نہیں مانگا۔ کبھی نہیں۔''

عائشہ چند لمحے پہلے اندر داخل ہوئی تھی اور اس نے اپنے شوہر کے آخری چند لفظ سن لیے تھے۔ دونوں کے چہروں کے تاثرات دیکھ کر اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ

MashalBooks.com

ہارون نے دوبارہ فرانس جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ بڑے نعمت خانے سے اس نے ایک کپڑا اٹھایا اور دروازہ بند کرتے ہوئے باہر نکل گئی۔

''تمہاری ماں کو یہ بات بتانا آسان نہ ہوگا۔ اس کی بڑی خواہش ہے کہ تم ہمارے ساتھ ہی رہو۔''

''میرا خیال ہے کہ اسے پہلے ہی اندازہ ہو گیا ہے۔''

ہارون کو اس بات کا اطمینان تھا کہ بالآخر انہوں نے بیٹھ کر معاملہ طے کر لیا ہے۔ یہ تو کرنا ہی تھا۔ وہ غور سے سگریٹ کے دھوئیں کو دیکھنے لگا۔ باپ اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

''اچھا۔ تم خوش تو ہونا ں بیٹا''

''ظاہر ہے ابا۔''

''خیر میرا بوجھ بھی ہلکا ہو گیا ہے۔ نوجوانوں کے اعتراضات کے باوجود ہماری روایت میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ میں خوب جانتا ہوں کہ ہم سب کی خواہشات مختلف ہوتی ہیں اور یہ بات فطری بھی ہے۔ جب انہوں نے میری شادی کی تو میں اپنی ایک کزن کو چاہتا تھا۔ لیکن میرے والدین رضامند نہ تھے۔ اس کے والدین سے ان کے فضول سے جھگڑے چل رہے تھے۔ خاندانی جھگڑے۔ اس کے باوجود میں تمہاری ماں کے ساتھ خوش ہی رہا۔ شادی تو درخت اگانے کی طرح ہوتی ہے۔ جاننا ہی پڑتا ہے کہ اس کی حفاظت کیسے کی جائے۔ تمہارا بھائی کہتا ہے کہ وہ اپنی بیوی خود منتخب کرے گا۔ لیکن ہم نہ تو اپنا وطن منتخب کرتے ہیں نہ ہی اپنی ماں کو۔ وہ تو بس مل جاتے ہیں۔ اپنی صدی کا انتخاب بھی انسان خود نہیں کرتا۔ بس وہ بھی مل ہی جاتی ہے۔ مقدر کا تعین کہیں اور ہوتا ہے میرے بیٹے۔ اور اگر ہمیں وہ سب کچھ پسند نہ ہو جو زندگی ہمیں پیش کرتی ہے تو پھر ہم اپنے آپ کو ضائع کر دینے کا خطرہ مول لیتے ہیں۔ زندگی کو، خدا کو کھو دینے کا خطرہ مول لیتے ہیں۔ یہ ٹھیک نہیں ہے بیٹا۔''

ہارون متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ جب بھی اس کا باپ اس انداز میں باتیں کرتا وہ ہمیشہ متاثر ہوا کرتا تھا۔ ہارون اس کی سچائی اور پرسکون اعتماد میں شریک ہونے کی خواہش کرتا تھا۔ اس نے باپ کو خاموشی سے دیکھا۔

دونوں ایک طویل لمحے کے لیے خاموش رہے۔

جب احمد اور ہارون باتیں کر رہے تھے، سگریٹ پی رہے تھے اور کافی کی چسکیاں لے رہے تھے تو فائزہ شام کے لیے بسکٹ تیار کر رہی تھی۔ باورچی خانے میں گیس کے چولھے کے پاس وہ بیٹھی تھی۔ لباس کی آستینیں کہنیوں تک چڑھ گئی تھیں اور اس کے بال نیلے سکارف میں لپٹے تھے۔ وہ گندھے ہوئے آٹے کی ہاتھوں پر ٹکیاں بنا کر گرم توے پر ڈالتی۔ پھر انہیں الٹا پلٹا کر پکاتی۔ اپنے کام میں وہ دلجمعی سے مصروف تھی۔ اس کے پاؤں کے پاس رکھے ہوئے رومال میں پکے ہوئے بسکٹوں کا ڈھیر لگ رہا تھا۔ اسے عائشہ کے اندر آنے کی خبر بھی نہ ہوئی جو نعمت خانے سے اٹھائے ہوئے رومال کو گھبراہٹ کے عالم میں مروڑ رہی تھی۔ ساس کی چیخ نما بلند آواز سے وہ چونکی۔

”ہارون فرانس واپس جا رہا ہے! یہ سب تمہارا قصور ہے۔ تمہیں میرے بیٹے کو یہاں رکھنا ہی نہ آیا۔“

فائزہ نے حیران ہو کر دیکھا تو عائشہ کی غصے سے بھری ہوئی آنکھوں سے اس کا سامنا ہوا۔ لیکن اس نے کوئی دھیان نہ دیا اور پھر سے بسکٹ بنانے لگی۔

”تم نے میرے بیٹے کو قابل رحم بنا دیا ہے۔“

فائزہ کی بظاہر لاپروائی سے وہ اور بھی چڑ گئی تھی۔

”سنتی ہو؟“

تنگ آ کر فائزہ آپے سے باہر ہو گئی۔ اس نے گندھا ہوا آٹا اٹھا کر بسکٹوں پر دے مارا۔ اٹھی، ہاتھ خشک کیے اور عائشہ کے پاس سے گزر کر باورچی خانے سے نکل گئی۔ حیران و پریشان عائشہ کمرے کے درمیان میں کھڑی رہی۔

”اب وہ پھر اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لے گی۔ بس اسے یہی کام آتا ہے۔ لعنت ہو اس گھر پر۔“

عائشہ کرسی پر بیٹھ گئی مگر اسے چین نہ تھا۔ وہ اچانک اٹھی اور صحن کی طرف چل دی۔ کپڑا اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ اسے ٹھیک کرنا چاہتی تھی۔ ننھا علی اپنے گنگھریالے بالوں اور ہنستے گلابی چہرے کے ساتھ ماں کی طرف لپکا اور حسب معمول اس سے لپٹ گیا۔ نفیسہ دیوار کے ساتھ گیند اچھال رہی تھی۔ ثمینہ انجیر کے درخت کے نیچے بیٹھی

MashalBooks.com

جمال کی ایک واسکٹ کے کالر کھول رہی تھی۔ وہ اسی طرح خاموش رہی جیسے وہ ہمیشہ گھر میں کسی المیے کے آغاز پر رہا کرتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ خاموش رہنے سے حالات زیادہ خراب نہیں ہوتے۔ حالانکہ اکثر اوقات معاملہ الٹ ہوتا تھا۔ جب سے فائزہ کے ساتھ اس کے سب سے بڑے بھائی کی شادی ہوئی تھی، ثمینہ بڑھتی ہوئی کشیدگی، جھگڑوں اور غلط فہمیوں کو بڑی مشکل سے برداشت کر رہی تھی۔ بچی، حساس، خیال پرست وار معصوم ہونے کی بنا پر اس کی خواہش تھی کہ دن جھگڑوں کے بغیر گزر جائیں۔ عائشہ نے محسوس کر لیا تھا کہ ثمینہ ہونے والے واقعہ کے متعلق کچھ نہ پوچھے گی۔ اس لیے اس نے اپنے بیٹے کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہوئی تو فائزہ کوئی لفظ کہے بغیر، اسے دیکھے بغیر کمرے سے باہر نکل گئی۔

''تم اس لیے غرور کرتی ہو کہ تم تھوڑا بہت پڑھ گئی ہو۔ مگر اس کا کیا فائدہ اگر تم اپنے شوہر کو بھی یہاں نہیں رکھ سکتیں؟''

فائزہ باورچی خانے میں واپس چلی گئی۔ لگتا تھا کہ اسے اب بھی پروا نہیں ہے۔ حالانکہ اس کا غصہ قابو سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ چیخ و پکار سن کر ہارون اندر آیا تو اس کا ماں سے آمنا سامنا ہو گیا۔

''کیا بات ہے؟''

''تمہاری بیوی میری کوئی عزت نہیں کرتی۔ پتہ نہیں خود کو کیا سمجھتی ہے۔ اور تم بھی اسے نہیں روکتے۔''

''تم ہی تو میری شادی کرنا چاہتی تھیں۔ میرا تو کوئی خیال نہ تھا۔''

وہ اپنی ماں کی طرح اونچی آواز میں بول رہا تھا اور فائزہ سب کچھ سن رہی تھی۔

''خدا گواہ ہے۔ میں تو صرف تمہاری بھلائی چاہتی تھی۔''

ہارون باہر نکل گیا۔

''عائشہ اور بھی زور سے رونے لگی۔ جھگڑوں اور لمحے کے موڑ میں پھنسی ہوئی وہ شدید دکھی تھی۔ اسے یوں لگتا تھا کہ جیسے اس کا بیٹا اس سے چھین لیا گیا ہو اور وہ روح کی گہرائیوں سے دکھ محسوس کر رہی تھی۔ لہٰذا کسی نہ کسی کو تو اس کے لیے ذمہ دار ہونا ہی تھا۔

احمد نے کچھ نہ سنا تھا۔ وہ چند لمحے پہلے باہر جا چکا تھا۔ رہا جمال تو وہ یہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا کہ ''روایت ہمیں یہی کچھ عطا کرتی ہے۔''

خیالوں میں کھوئی ہوئی ثمینہ اس بات پر حیران ہو رہی تھی کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ کون ٹھیک ہے اور کون غلط۔ اسے یوں لگتا تھا کہ کوئی شے ٹوٹ گئی ہے اور اب وہ جڑ نہ سکے گی۔ وہ بھابھی کے پاس جانا چاہتی تھی جسے وہ بہت پیار کرتی تھی لیکن صورت حال کو مزید خراب کرنے اور ماں کو اور بھی ناراض کرنے کے خوف سے وہ بیٹھی رہی۔ آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور وہ اپنے کام میں مگن تھی۔ وہ پریشان تھی اور سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بچوں نے گیند کے ساتھ دوبارہ کھیلنا شروع کر دیا تھا اور دوسروں کی طرح وہ بھی اب چیخ رہے تھے۔

ہارون کو جو پہلی بس ملی، اس میں بیٹھ کر اب وہ الجیرس کے مرکز میں پہنچ چکا تھا۔ خود بخود وہ اخباروں کے ایک سٹینڈ کے آگے رک گیا اور کسی دلچسپی کے بغیر اخباروں کی تصویریں دیکھنے لگا۔ پھر اس نے مراد سٹریٹ کا رخ کیا۔ فرانس واپس جانے کا ارادہ کرنے اور اس کا اظہار کرنے کے بعد اب وہ کسی قدر آزادی محسوس کر رہا تھا۔ نوکری تلاش کرنے کی بے سود کوشش بوجھ بن گئی تھی اور وہ چڑ سا گیا تھا۔ بے ارادگی کی کیفیت بھی اذیت ناک تھی۔ پھر اس نے خود کو اس بات کا یقین بھی دلانا تھا کہ باہر اتنے برس گزارنے کے بعد خانگی زندگی آسان نہ تھی۔ شروع کا وقت تو تقریبات کی نذر ہو گیا اور زیادہ خواہش سے بغیر کی اس شادی کے تمام تضادات کے بغیر اسے یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ میلے میں آیا ہو۔ اس نے خوشیوں کے خوب مزے لیے اور عزیز و اقارب کے میل جول کا لطف لیا۔ لیکن بہت سی غیر ملکی عادتیں اختیار کرنے کے بعد خانگی زندگی کی پابندیاں اسے پریشان کرنے لگی تھیں۔

حسب معمول مراد سٹریٹ میں بھیڑ تھی۔ لیکن یہاں ہارون کو اپنے دوست صلاح اور محمود بھی مل گئے۔ خوشی سے انہوں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا مل کر کافی پی۔ فلم دیکھنے کا ارادہ کیا اور پھر خود ہی ترک کر دیا۔ ہارون کو صلاح کی تجویز پسند آئی۔ جلد ہی وہ ساحل پر جانے کے قابل نہ رہے گا۔ میلہ ختم ہو جائے گا۔

کاش ہم پیرس سے تیس کلومیٹر کے فاصلے سے بس لے کر سمندر تک جا سکتے۔ نرم ریت اور دھوپ۔ ہنستے ہوئے اس نے صلاح سے کہا:

''بھئی جب تک یہاں ہو سمندر کے مزے اڑاؤ! پیرس آؤ گے تو اس کے بغیر

ہی گزارہ کرنا ہوگا۔''

فائزہ کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گئی اور اپنی سہیلی مریم کو خط لکھنے لگی جسے اس نے شادی کے بعد سے نہیں دیکھا تھا۔

''مریم، آ ؤ مجھے دیکھو- آ ؤ کہ میں نے تم سے بہت سی باتیں کہنی ہیں۔ آ ؤ- آ ؤ- میرا شوہر واپس فرانس جا رہا ہے۔ وہ مجھے اکیلا چھوڑ رہا ہے۔ یہاں اپنے والدین کے پاس۔ اس کی ماں اس کے جانے کے لیے مجھے الزام دیتی ہے حالانکہ میرا اس بات سے کوئی تعلق نہیں۔ ماں کی وجہ سے وہ مجھے مارتا ہے اور اس بات کے لیے میں کبھی اسے معاف نہ کروں گی۔ مریم، بس تم چلی آ ؤ۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ میں ماں بننے والی بھی ہوں۔''

جو جی میں آیا وہ لکھتی رہی۔ پھر رک گئی۔ اس کا جی چاہنے لگا کہ وہ خط کو پھاڑ دے اور مریم کو صرف یہاں آنے کے لیے کہے۔ مگر اس میں حوصلہ نہ تھا۔ اس میں خط پھاڑنے اور نیا لکھنے کا حوصلہ نہ تھا اور نہ ہی اپنے والدین کو کچھ لکھنے کی ہمت تھی۔ حالانکہ وہ ایسا کرنے کی قسم کھا چکی تھی۔ بس وہ اس خط کو یونہی بھیج دے گی۔ لیکن کیسے۔ ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ یہ خط جمال کو دے دے۔

ہارون اور اس کے دوست کئی گھنٹوں تک تیراکی کرتے، دھوپ سینکتے اور سمندر کی تازہ ہوا کے لطف لیتے رہے۔ انہوں نے خربوزے، انجیریں اور مرغ کھایا۔ ہاں واقعی یہ چھٹی کا دن لگتا تھا۔

ایک بہت ہی خوبصورت فورڈ کاران کے قریب آ کر رکی۔ تینوں دوست اسے دیکھنے لگے۔ اس میں سے دو جوڑے اترے اور سمندر کی طرف قدم اٹھانے لگے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ دے رکھے تھے۔ صلاح تو تو صرف عورتیں ہی نظر آتی تھیں اور اس نے ایک آہ سی بھری۔ وہ عورتیں اور مرد سمندر میں گئے، تیراکی کے مزے اڑائے، ہنسے کھیلے اور ایک دوسرے کے بوسے لیے۔ اچانک ہارون یوں اٹھ کھڑا ہوا جیسے ان آنے والوں نے اسے ناراض کر دیا ہو۔ وہ کپڑے پہننے لگا۔ اس کی پیروی میں صلاح اور محمود نے بھی اپنی گردنوں اور پیٹھوں سے ریت جھاڑی اور کپڑے پہننے لگے۔ ساحل سے آتے ہوئے وہ فورڈ کار کے پاس سے گزرے اور محمود نے تعریفی انداز میں کار

کے گرد چکر لگایا۔

''اس قسم کا کھلونا کتنے میں آ جاتا ہے؟''

''ایسی کار ہو تو پھر عورتوں کی کمی نہیں ہوتی۔''

صلاح کی نہ تو کوئی تربیت ہوئی تھی۔ نہ ہی اس کے پاس کوئی نوکری، بیوی یا گرل فرینڈ تھی۔ طوائفوں کے دامن میں پناہ لینا، جو ہر جگہ کی طرح الجیرس میں بہت تھیں، اسے ذلت آمیز لگتا تھا۔ اس لیے اسے کار سے زیادہ عورتوں سے دل چسپی تھی۔ وہ تو کمترین عورت پر بہترین کار قربان کر دینے پر بھی تلا ہوا تھا۔

ہارون نہ اس ڈی لکس کار میں اور نہ ہی ان مختلف قسم کی عورتوں میں دلچسپی لے رہا تھا۔ ان تینوں کو کار کے گرد دیکھ کر ان نئے آنے والوں میں سے ایک کو تشویش ہوئی۔ لیکن جب وہ چلنے لگے تو وہ بھی اپنی حسین ساتھی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

تینوں دوست پرتکلف باغوں سے گھری ہوئی کوٹھیوں والی گلیوں میں سے گزر رہے تھے۔

محمود نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''شاید اس علاقے میں کرائے پر کوئی سستی جگہ بھی مل جائے۔''

''ضرور، ہم پوچھ لیتے ہیں تمہاری خاطر۔''

صلاح ہنسنے لگا۔ بیوی کے بغیر اس قسم کے بنگلے کو میں کیا کروں گا؟ ہاں یہ بھی سچ ہے کہ میرے پاس ایسا بنگلہ ہوتا تو بیوی بھی ضرور مل جاتی۔

وہی فورڈ کار آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے پاس سے گزری۔ چاروں خوش باش افراد بھی اس میں بیٹھے تھے۔ گاڑی ایک بہت ہی اچھے ریسٹورنٹ کے آگے رک گئی۔ دوسری کاریں بھی پہنچنے لگیں۔ ریسٹورنٹ کے الف لیلوی ماحول میں محبت کی پینگیں بڑھانے اور دوستانہ کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ تینوں دوست قیمتیں دیکھنے کے لیے ایک چسپاں مینو کے سامنے رک گئے پھر انہوں نے اندر جھانکا۔ مدھم روشنیاں نقش و نگار پر منعکس ہو رہی تھیں۔ ڈنر کے لیے کچھ لوگ پہلے ہی بیٹھ چکے تھے۔ کچھ سیاح بھی تھے۔ قومی اور بین الاقوامی خوش بخت لوگ۔

''تمہیں اس سے بھوک تو نہیں لگ گئی۔ خیر، آؤ۔ پہلی دکان آتے ہی میں تمہیں

نان کباب خرید دوں گا۔ ہاں کوئی دکان ہوئی تو''

ہارون اور صلاح ہنسنے لگے۔

''آ ؤ چلیں''

دوستوں کے ساتھ طویل وقت گزارنے کے بعد ہارون گھر پہنچا تو دیر ہو چکی تھی۔ فائزہ آئینے کے سامنے اپنے بال سنوار رہی تھی۔ وہ اس کی طرف پلٹی۔ اس کا چہرہ ایسے شخص کی طرح پرسکون تھا جس نے دوستوں کے ساتھ ساحل پر دن گزارا ہو اور سہ پہر کے آغاز میں ہونے والی تمام تلخ باتیں بھول چکا ہو۔ اس نے ریڈیو آن کیا۔ فٹ بال کے میچ کے آخری حصے کا پروگرام نشر ہو رہا تھا۔ اس نے بیٹھ کر چند لمحوں کے لیے پروگرام سنا اور پھر لیٹ گیا۔

''اچھا تو تم جلد ہی فرانس واپس جا رہے ہو؟''

اس نے دھیمے لہجے میں مگر مضبوطی سے پوچھا۔

''مجھے یہاں کوئی نوکری نہیں ملی۔ میں ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ کام نہ ملا تو واپس چلا جاؤں گا۔''

''کیا مجھے ساتھ لے جاؤ گے؟''

''نہیں، فائزہ۔ بالکل نہیں۔''

''اچھا تو یہاں مجھے اکیلا، حاملہ چھوڑ رہے ہو؟''

''تمہیں اکیلا تو نہیں چھوڑ رہا ہوں۔ میرے والدین یہاں ہیں۔ یہ تو ایسا خاندان ہے کہ بہت سے لوگ اس پر رشک کرتے ہیں۔ یہاں تمہیں گھر کے بچوں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ تم چاہو تو خوش بھی رہ سکتی ہو۔ ہاں ماں کے ساتھ مل کر رہنا سیکھنا ہوگا۔ اس کے خیالات تم سے مختلف ہیں۔ لیکن وہ اچھی عورت ہے اور اس کا غصہ جلد ہی ختم ہو جاتا ہے۔ پھر وہ تمہارے لیے ایک بہترین مثال بھی تو ہے۔''

وہ اکھڑ پن اور تیزی سے بول رہا تھا۔ فائزہ اس کی برہمی کو بھانپ گئی۔

''ہارون، خدا کے واسطے مجھے یہاں نہ چھوڑو۔ مجھے ساتھ لے جاؤ۔ میں منت کرتی ہوں''اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

ہارون کو تعجب ہوا اور اس کے لہجے سے زیادہ برہم بھی ہو گیا۔

MashalBooks.com

’’تم میرے ساتھ نہیں جاسکتیں فائزہ۔ بس پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں۔ فرانس ایسی جگہ نہیں جہاں تم جاسکو۔ ایک مرد کے لیے وہاں رہنا ہی مصیبت ہے اور عورت کے لیے تو اور بھی مشکل ہے۔ تم نہیں جانتیں۔ وہاں تم اور بھی تنہا ہو جاؤ گی۔ میں صبح سویرے جایا کروں گا اور راتوں کو دیر سے لوٹا کروں گا۔ سارا دن تم تن تنہا کیا کیا کرو گی؟‘‘

’’بعض لوگ تو اپنے بیوی بچوں کو ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو فرانسیسی نہیں بول سکتے جب کہ میں بول سکتی ہوں۔ لکھ سکتی ہوں پڑھ سکتی ہوں۔‘‘

ہارون غور سے فائزہ کو دیکھنے لگا۔ اس شام وہ اسے بہت حسین اور پرکشش لگ رہی تھی۔ اس نے فائزہ کی خواہش کی لیکن اس کی ہٹ دھرم مزاحمت سے چڑ گیا۔

’’نہیں، فائزہ نہیں۔ نہیں تم یہیں ٹھیک ہو اور کبھی باہر نہ جاؤ گی۔‘‘

فائزہ نے کروٹ لی اور خاموش ہوگئی۔ ہارون نے اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھ دیا۔ وہ تیزی سے پلٹی اور پلنگ کے کنارے پر ہارون سے منہ موڑ کر بیٹھ گئی۔

’’ماں ٹھیک ہی کہتی ہے فائزہ۔ تمہارا مزاج بگڑا ہوا ہے۔ اس لیے میں جتنا کم یہاں رہوں، اتنا ہی ہم سب کے لیے اچھا ہے۔‘‘

اس نے کپڑے پہنے اور کمرے سے نکل گیا۔ فائزہ خاموش بیٹھی رہی۔ اس لمحے وہ اس سے نفرت کر رہی تھی۔ اسے دفع ہونے دو۔ وہ پروا نہ کرے گی۔ لیکن جونہی اس کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا۔ اسے یاد آیا کہ اس زندگی سے جو اس پر ٹھونسی جا رہی ہے بچنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ فرانس چلی جائے۔ پیرس میں وہ اکیلے دونوں رہیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ دونوں کہیں اور رہیں اور آزاد ہوں تو وہ بدل جائے۔ یا پھر بچے کی آمد سے۔ شاید وہ ایک دوسرے سے محبت کرنا بھی سیکھ جائیں۔ شاید وہ بھی کوئی کام کرنے لگے۔ دل کی گہرائیوں سے وہ اس محبت کی خواہش مند تھی۔ ہوتی بھی کیوں نہ، وہ دونوں میاں بیوی تھے اور وہ محبت کے خلا کو بری طرح محسوس بھی کرتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ مل کر حقیقی ہنستا کھیلتا گھر بنانے کے قابل ہونے کی آرزو رکھتی تھی۔ گھر جس میں بچوں کی پال پوس مناسب ہو۔

صحن میں سگریٹ پیتے ہوئے ہارون بار بار آسمان کو بھی دیکھ رہا تھا۔ باہر سماں خوبصورت تھا۔ اسے چند ہفتے اپنی آمد کا وقت یاد آیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ ابھی آیا ہو اور

یہ بھی کہ اسے آئے صدیاں بیت گئی ہوں۔ ٹیکسی رینگتی ہوئے ان کے دروازے کے آگے رک گئی تھی۔ ان کا گھر ویسے کا ویسا ہی تھا۔ شاید وہ یونہی رہے گا۔ اسے اس بات کا یقین تھا۔ ماں آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اس کی منتظر تھی۔ اس کی نا قابل بیان، نا قابل فراموش نظریں، ماںتا کے جذبے سے لبریز نگاہیں اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس کا باپ ہمیشہ کی طرح باوقار اور خوش تھا۔ بہت ہی خوش کہ اس کا بڑا بیٹا گھر لوٹ آیا تھا۔ وہ اس بات پر بھی خوش تھا کہ بیٹا شادی پر رضامند ہو گیا ہے۔ اس کے باپ میں بھی کوئی تبدیلی نمایاں نہ ہوئی تھی۔ وہ بس ویسے کا ویسا ہی تھا۔ ان رسوم کا روایات جن میں اسے اتنا ہی یقین تھا جتنا خدا میں۔ چھوٹا بھائی علی اس قدر خوش تھا کہ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو دیکھے جا سکتے تھے۔ ہر کوئی اسے دیکھ کر خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ اور پھر سہمی سہمی سی خوبصورت نفیسہ اور ثمینہ۔ واہ کیا عجیب بات ہے۔ جب وہ گیا تھا تو وہ بچی تھی اب وہ جوان لگتی تھی۔ خوبصورت اور جوان۔ بچے تالیاں پیٹنے لگے تھے اور وہ ایک ایک کر کے تحفے نکال رہا تھا۔ جمال نئے کیمرے کو ہر زاویے سے دیکھ کر خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔

جب وہ گیا تھا تو جمال بھی بچہ تھا۔ اب وہ تقریباً مرد بن چکا تھا اور ہر شے کے متعلق اس کے اپنے خیالات بھی تھے۔ ثمینہ سامان کھول رہی تھی اور ماں نئی گھڑی باندھے خوشی سے جھوم رہی تھی ’’ہمیں تمہاری کمی دکھ دیتی رہی ہے بیٹا۔ آخر ان تمام تحفوں کی کیا ضرورت تھی۔‘‘

اسے وہ دن بھی یاد آیا جب وہ بڑے بڑے پتوں والے درخت کے نیچے ماں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ گرمی بہت تھی۔ فائزہ نے انہیں کافی دی تھی۔ ماں نے اسے ویسے گلے لگا لیا جیسے وہ بچپن میں لگایا کرتی تھی۔ اس لمحے محبت کی خواہش اس پر غالب آ گئی۔ سگریٹ اس نے پھینکا اور بیڈ روم کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ فائزہ بستر پر لیٹی تھی۔ وہ بھی بستر پر دراز ہو گیا اور فائزہ کو بازوؤں میں لے لیا۔

جنس کے بارے میں فائزہ کچھ نہ جانتی تھی۔ اسے تعجب ہوا کہ خود کچھ محسوس کیے بغیر وہ شوہر کو موقع دے دیتی ہے۔ اس نے مرد کے لطف کو دریافت کیا۔ وہ یک طرفہ لیکن بھرپور مسرت جو اسے نظر انداز کر دیتی تھی لیکن اس کے بغیر سراسر محال ہوتی۔ اس نے اپنا حصہ ابھی نہیں چکھا تھا۔ ہاں اس کی تنہائی کا احساس ضرور بڑھ جانا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا

کہ اگرچہ اب وہ ہارون کو پہلے سے بہتر طور پر جانتی ہے لیکن اس کا اپنا وجود اب بھی پراسرار تھا - مزاحمت، خواہش اور توقعات سے بھرپور۔ ناقابل فہم اور طرح دے جانے والا وجود جو اب اندر ہی اندر ایک بچے کو تیار کر رہا تھا اس کے دل اور جسم دونوں شدید پیاس کے باوجود ابھی تک پیاسے تھے۔

''یہاں تم کیا کر رہے ہو؟''

''ہم لوگ ابھی سٹیڈیم سے آئے ہیں۔''

''اور تمہارا جاب ٹریننگ سکول؟''

''آج جمعرات ہے نا''

''جمعرات؟ اچھا اچھا۔ ٹھیک ہے۔''

ہارون اور جمال کا اچانک آمنا سامنا ہو گیا تھا۔ جمال نے دوستوں کو خدا حافظ کہا اور بھائی کے ساتھ چلنے لگا۔

''تمہارا کیا خیال ہے جاب ٹریننگ کے بعد تمہیں کوئی نوکری مل جائے گی؟''

''ٹریننگ کا مقصد ہی یہی ہے۔ آئندہ سال فیکٹری والے مجھے لے لیں گے۔''

''یہ اچھی بات ہے۔''

''تم پھر جا رہے ہو؟''

''ہاں۔''

جمال ہارون کی روانگی کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ اس سے بات کرنا دشوار ہی اتنا تھا۔ وہ تو بس اپنی دیواروں کے اندر بند رہتا تھا۔ پھر دونوں میں باتیں ہی اتنی کم ہوتی تھیں۔ ہارون ہر وقت چوکنا رہتا اور ہر وقت اس کے موڈ کے بگڑنے کا خطرہ رہتا تھا۔

''کوئی کام یہاں نہیں ملا؟''

''نہیں۔ تمہیں پتہ ہی ہے۔''

''تم جا رہے ہو۔ اور تمہاری بیوی بچے کو جنم دینے والی ہے۔''

اسے فوراً احساس ہو گیا کہ وہ پٹڑی سے اتر رہا ہے۔ ہارون چونکا۔

''تمہیں ابھی تک میری بیوی کی پریشانی لاحق ہے؟ اپنے کام سے کام رکھو۔''

''آں، برا نہ مناؤ۔ کیا ہم بات بھی نہیں کر سکتے، کیا ہم۔''

''کسی اور شے کے متعلق کر سکتے ہیں اگر تم چاہو۔ لیکن تم اپنے کام سے ہی غرض رکھو۔ زندگی کا تمہیں کیا پتہ ہے؟''

''تمہاری عمر میں میں منہ بند ہی رکھتا تھا۔''

''یہ تو ہے۔ لیکن وہ حالات بدل گئے ہیں۔''

''نہیں۔''

ہارون نے رک کر غصے سے بھائی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ دونوں ایک دوسرے سے اس قدر مختلف تھے کہ ان کے درمیان کوئی مکالمہ نہ ہوسکتا تھا۔ اچانک ہارون اسے وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ جمال اپنی جگہ پر کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔ پھر دوستوں کی طرف متوجہ ہوا جو ابھی اسی جگہ کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ناراض اور زچ جمال ان میں شامل ہو گیا۔

''کیا بات ہے؟ کوئی جھگڑا ہوا؟'' جمال کے سب سے گہرے دوست مختار نے پوچھا۔

''وہ- وہ- میرا بھائی فرانس واپس جا رہا ہے۔ اس نے یہاں کام تلاش کرنے کی بہت کوشش کی، لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ ماں باپ نے اس کی شادی میری عمر کی ایک لڑکی سے کر دی ہے۔ دونوں نے شادی سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہ تھا اور لگتا ہے کہ اب بھی وہ ایک دوسرے کے ساتھ خوش نہیں ہیں۔ پرانے وقتوں کے انداز کی شادی۔ لگتا ہے کہ میرے خاندان میں گزشتہ پچاس برسوں سے کوئی تبدیلی نہیں آئی۔''

''یہ سب مجھے معلوم ہے۔ اور کیا ہوا ہے؟''

''اور کیا؟ بس وہ واپس جا رہا ہے۔ اس کی بیوی کے ہاں بچہ ہونے والا ہے۔ ہمارے ساتھ وہ خوش نہیں ہے- میں اپنے لیے کبھی یہ بات قبول نہ کروں گا......''

''میں بھی نہیں۔'' مختار نے لقمہ دیا۔

''اوہ، میں بہت سوں کو جانتا ہوں۔'' سعید نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا ''جو یہی دعویٰ کرتے ہیں لیکن جب وقت آیا تو شکست مان گئے۔ وجہ یہ ہے کہ جو عورتیں رسوم ورواج کی اسیر نہیں ہوتیں وہ بڑی مشکل ہوتی ہیں۔ ان سے نمٹنا آسان نہیں ہوتا۔''

''عورتوں کو آزادی دی جائے تو وہ اس کا غلط استعمال کرتی ہیں۔''، خلیل کہنے لگا۔ ''میں تو ایسی عورت سے شادی نہ کروں گا جو کنواری نہ ہو۔ چاہے مجھے اس سے بے پناہ محبت ہو۔''

''ہاں ہاں ٹھیک ہے۔لیکن جب تمہیں کوئی عورت مل جائے تو خوش ہوتے ہو۔ بس یہ صرف منافقت ہے۔نری منافقت۔ان تمام تعصّبات کا اور مقصد ہی کیا ہے؟''

جمال نے خلیل کو پوری شدت سے جواب دیا تھا۔ یہ کہ اس کے بھائی کا تعلق ایک بالکل مختلف نسل سے ہے، لہٰذا اس کا رویہ قابل فہم ہے۔لیکن اگر اس کے دوستوں کا نقطہ نظر ویسا ہی ہو تو یہ بات نا قابل برداشت ہو گی۔ وہ انہیں چھوڑ کر جانے کی خواہش محسوس کر رہا تھا۔طاہر نے اس کا موڈ بھانپ کر جلدی سے موضوع بدل دیا۔

''تم ہر وقت عورتوں کی باتیں کرتے رہتے ہو۔ یہ گھسا پٹا ریکارڈ بدل بھی دو۔ ہاں ریکارڈ سے مجھے یاد آیا کہ کیوں نہ ہم انور کی طرف چلیں۔اس کے پاس بہت سے ریکارڈ ہیں۔''

''او کے۔چلو چلیں۔''

وہ ان سحر انگیز ریکارڈوں کی جانب قدم اٹھانے لگے جو ہر شے کو بھلا دینے کی پراسرار طاقت رکھتے ہیں۔ وہ بوسیدہ کیمرے والے اس بوڑھے کے قریب سے گزرے جو پرانے وقتوں کی یادگار لگتا تھا۔ جمال اور اس کے دوست ایک پل کے لیے رکے پھر آگے بڑھ گئے۔

''اس بوڑھے کے کیمرے کو ذرا دیکھنا اور پھر سیاحوں کے کیمروں پر نظر ڈالنا۔ عجب سا لگتا ہے۔'' مختار نے کہا۔

''اور ان کے متعلق کیا خیال ہے جو امیر چوک میں بک رہے ہیں۔ دیکھا ہے تم نے انہیں؟ میں بھی جلد ہی ایک آٹومیٹک کیمرہ حاصل کر لوں گا۔ ہوں۔ میرا شوق فوٹوگرافی ہے، عورتیں نہیں۔''

''تم ہر شے فوراً ہی تو حاصل نہیں کر سکتے۔''

''ایک سے دوسرے کی نفی تو نہیں ہوتی۔''

''جب تک تم کیمرہ نہیں خریدتے، اپنا کام اس بوڑھے جیسے کسی کیمرے سے چلالو۔''

جمال اوراس کے دوست ہنس دیے۔ ہارون نے فرانس سے واپسی پر جو کیمرہ اسے دیا تھا وہ اسے بہت اچھا لگتا تھا لیکن اس نے زیادہ استعمال اس لیے نہیں کیا تھا کہ فلم بہت مہنگی تھی۔ اس نے کیمرے کا ذکر دوستوں سے نہیں کیا تھا کہ کہیں وہ مستعار نہ مانگ لیں۔ یہ تو آپ کو پتہ ہی ہے کہ چیز ایک دفعہ چلی جائے تو پھر اس کی واپسی کا یقین کم ہی ہوتا ہے۔

اسے اس خیال پر شرم سی آئی۔ وہ مختار کو کیمرہ مستعار دیدے گا اور کسی کو نہیں۔ اسے بھی فوٹوگرافی پسند تھی۔ وہ مل کر خوبصورت تصویریں اتارنا اور پھر انلارج کرنا سیکھیں گے۔ اس کے لیے مزید آلات کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر وہ سب کو اپنی تصویریں دکھائیں گے۔ اس لمحے اس نے سوچا کہ وہ عورتوں کی تصویریں اتارنا بھی پسند کرے گا۔ بہت سی عورتوں کے چہروں کی۔

دس پندرہ منٹ بعد وہ سب عبدل کے اس چھوٹے سے کمرے میں پہنچ چکے تھے جس میں وہ دو بھائیوں کے ساتھ مل کر رہتا تھا۔ ڈسکو میوزک پوری آواز سے چل رہا تھا۔ چار مربع میٹر کی کھلی جگہ میں رقص موسیقی نے سب پر جادو کر دیا۔ خواہشیں، دبے ہوئے احساسات، خوف، خدشے اور مایوسیاں۔ عبدل کی ماں نے اندر جھانکا اور بولی:

''تم لوگ شور ذرا کم نہیں کر سکتے!''

لڑکے ہنسنے لگے اور انہوں نے اس جملے پر کوئی توجہ نہ دی۔ صحت مند جوش و ولولہ۔ تال اور آواز۔ یہاں تک کہ جسم بے بس ہو جائیں اور ذہن ماؤف۔

فائزہ ہارون کا سامان تیار کر رہی تھی۔ اس نے کچھ اور اشیا رکھیں اور اپنی شادی کی ایک تصویر دو قمیضوں کے درمیان رکھ دی۔ ہارون کمرے میں داخل ہوا اور پلنگ پر یوں بیٹھ گیا جیسے وہ بہت تھکا ہوا ہو۔

''کیا یہ تیار ہے؟''

''ہاں۔''

اس نے فائزہ کو اپنے پاس پلنگ پر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر پاس چلی گئی۔ دونوں ایک طویل لمحے تک ساتھ ساتھ بیٹھے رہے۔ پھر ہارون نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور محبت سے اسے دیکھنے لگا۔

''فائزہ مجھے مجبوراً کام کی وجہ سے جانا پڑا ہے۔ تم یہاں ناخوش نہ رہو گی۔ میں نے ماں سے بات کی ہے۔ اسے بس تمہاری بھلائی سے غرض ہے۔''

فائزہ نے خاموشی سے اسے دیکھا۔

''فرانس میں حالات ویسے نہیں ہیں جیسے تم سب لوگ یہاں بیٹھ کر سمجھتے ہو۔ تمہارا خیال ہے کہ وہاں زندگی آسان ہے۔ مگر یہ محض وہم ہے۔ میں تمہیں اس لیے ساتھ نہیں لے جا سکتا کہ میں وہاں چار دوستوں کے ساتھ ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتا ہوں۔ پیرس میں کرائے بہت ہیں۔ میری تنخواہ میں تو ہم اچھا سا گھر بھی نہیں لے سکتے۔ پھر میں تمہیں اس لیے بھی ساتھ نہیں لے جا سکتا کہ وہاں کے لوگ ہمیں اچھا نہیں سمجھتے۔ وہ ہمارا احترام نہیں کرتے اور میں یہ بات کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ تمہارا احترام نہ کیا جائے۔''

وہ خاموشی سے سنے جا رہی تھی اور متاثر بھی ہوئی تھی۔ جیسے آج شام وہ اس سے باتیں کر رہا تھا، ویسے اس نے پہلے کبھی نہ کی تھیں۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کی عزت ویسے

نہیں کی گئی جیسے وہ چاہتی تھی۔ پھر بھی یہ کیا کم ہے کہ وہ اس کی عزت کروانا چاہتا ہے۔ پھر تو سب کچھ ممکن ہے۔ لگتا تھا کہ تمام دروازے یکدم کھل گئے ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کبھی اچھی طرح گزارہ کرسکیں۔ ایک دوسرے کی سنیں، ایک دوسرے کو سمجھیں۔ اس نے کپڑے اتارے اور بستر میں گھس گئی۔

''اچھا اب بستر میں آ جاؤ۔ سفر کے لیے تمہیں اب آرام کرنا چاہیے۔ تم کل صبح سویرے جا رہے ہو۔''

ہارون نے فائزہ کو اس طرح کبھی باتیں کرتے نہ سنا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ عورت ہے۔ پہلی بار اسے لگا کہ وہ اسے قبول کرتی ہے جیسا کہ وہ ہے۔ اس بات کے لیے وہ اس کا ممنون تھا۔ لیکن آج کی رات وہ اسے بازوؤں میں لینے کے قابل نہ تھا۔ کپڑے پہنے وہ بستر میں لیٹا رہا۔ سگریٹ پر سگریٹ پیتا رہا۔ آخر اس کی زندگی میں یہ روانگیاں اور یہ ہجرتیں کیوں ہیں؟ کیا یہ اس پر مسلط کی گئی ہیں؟ یا اس نے خود منتخب کی ہیں؟ اسے کچھ پتہ نہ تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ یہاں فائزہ کے ساتھ رہنا چاہتا ہے یا اسے چھوڑنے کو ترجیح دیتا ہے۔ روانگی پر وہ خوش تھا پھر بھی اس کے باطن میں کہیں نہ کہیں دکھ بھی تھا۔ لیکن وہ نہ جانتا تھا کہ کون سی شے اسے دکھ دے رہی ہے۔ اس وقت اس کی زندگی ایسے لمحات پر مشتمل لگتی تھی جو ایک دوسرے سے جڑے نہ ہوں۔ کسی تسلسل کے بغیر ایک دوسرے سے قطعی طور پر مختلف ہوں۔

دوسرے روز صبح سویرے ہارون چھوٹے بھائی کے ساتھ گھر سے روانہ ہوگیا۔ بھائی نے سب سے بڑا سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا۔ بچے بھی جاگ رہے تھے اور ماں سے لپٹے ہوئے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ احمد خاموش، دکھی اور درماندہ دکھائی دیتا تھا۔ ہارون کی روانگی کو وہ ناکامی سے تعبیر کرتا تھا۔ اگر وہ ہارون کے لیے کام ڈھونڈ سکتا تو وہ ان کے ساتھ، اپنی بیوی کے ساتھ اور چند ماہ بعد پیدا ہونے والے بیٹے کے ساتھ ہی رہتا۔ اور اس سے زیادہ تکلیف دہ بات اور کیا ہوتی ہے کہ کوئی شخص وہ چیز دینے کے ناقابل ہو جو دینے کی وہ خواہش رکھتا ہو۔ اپنے سسرال والوں کے پیچھے کھڑی فائزہ نے دہلیز پار نہ کی تھی۔ وہ جذبات سے عاری رہی۔ پریشان ثمینہ اس کے ساتھ کھڑی تھی۔ موڑ مڑنے سے پہلے ہارون نے ہاتھ ہلایا اور پھر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ عائشہ نے واویلا کیا ''میرا بیٹا۔''

پھر وہ آنسوؤں سے بھرے ہوئے چہرے کے ساتھ فوراً اندر چلی گئی۔ بچوں نے ابھی تک اس کا دامن پکڑ رکھا تھا۔ احمد اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوا۔ فائزہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ثمینہ اس کے پاس جانے سے ہچکچا رہی تھی۔ عائشہ نے اسے آواز دی کہ آ کر بچوں کو سنبھالے۔ وہ فوراً چلی گئی۔

فائزہ گدے پر گر کر رونے لگی۔ اسے ایسے خاندان کے پاس چھوڑے جانے پر دکھ تھا جسے وہ اپنا نہ سمجھتی تھی۔ جس میں وہ خود کو اجنبی محسوس کرتی تھی۔ اسے ایسے مقدر کا دکھ تھا جسے وہ قبول کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ اسے اپنی بے بسی پر رونا آیا۔ وہ ان پر جوش جذبوں، جھگڑوں اور غلط فہمیوں کے لیے روئی۔ اپنی ناکام امیدوں اور ادھوری خواہشوں کے لیے۔

MashalBooks.com

ہارون کے جانے کے بعد مایوسیوں، آزردگیوں اور جدائی سے پیدا ہونے والے خلا کے احساس کے ساتھ زندگی سب کے لیے مشکل ہوگئی تھی۔ احمد اب زیادہ تر خاموش رہتا تھا۔ اسے اس بات کا قلق تھا کہ وہ ایسے ضروری تعلقات بھی پیدا نہیں کر سکا جن کی بنا پر اس کے بیٹے کو کام مل جاتا اور وہ پردیس نہ جاتا۔ عائشہ زودرنج ہوگئی تھی۔ غم نے اسے نڈھال کر دیا تھا مگر اسے یقین تھا کہ اس کے بیٹے کی جدائی کی ذمہ دار صرف اور صرف فائزہ ہے۔ اس بات نے ناقابل برداشت ماحول پیدا کر دیا تھا۔ وہ فائزہ سے کوئی بات نہ کرتی سوائے یہ بتانے کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ ہر بات پر وہ چڑ جاتی۔ یہاں تک کہ بچوں کے ساتھ بھی اس کا رویہ بدل گیا تھا اور اب وہ پہلے سے زیادہ رونے لگی تھی۔ ثمینہ پہلے سے بھی زیادہ دور اندیش، اطاعت شعار اور مصالحت پسند ہوگئی تھی۔ جیسے اس کی زندگی کا مقصد ہی دوسروں کی خدمت کرنا، دکھوں کو کم کرنا اور خرابیوں میں اضافے کو روکنا ہو۔ جمال باہر رہنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا۔ گھر کے ماحول سے اسے گھٹن کا احساس ہوتا تھا۔

جونہی موقع ملتا فائزہ اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیتی۔ کمرے میں وہ سکون تلاش کرتی لیکن وہ اس کے مقدر میں نہ تھا۔ لمحہ بھر کے لیے اسے کھڑکی سے باہر جھانکنا اچھا لگتا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اس سے چڑ جاتی۔ اسے یاد آتا کہ وہ باہر نہیں نکل سکتی۔ یہاں تک کہ ان نوجوان عورتوں کی طرح سیر بھی نہیں کر سکتی جو اس کی کھڑکی کے آگے سے گزرتیں اور جن پر اسے رشک آتا تھا۔ سینے پرونے میں اس کا جی نہ لگتا تھا یہاں تک کہ وہ ہونے والے بچے کے لیے کچھ بُننے پر بھی خود کو آمادہ نہ کر پائی تھی۔ لاشعوری طور پر وہ بچے سے نالاں تھی کہ وہ نئے خاندانی ماحول کا اور بھی زیادہ محتاج بنا دے گا۔ ویسے رواج کے مطابق ماں بن جانے کے بعد اسے نئے حقوق بھی حاصل ہونے تھے۔ ان باتوں کے

MashalBooks.com

باوجود فائزہ کو گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی پسند تھی جس سے ہنستے کھیلتے بچے دکھائی دیتے تھے۔ انہوں نے خود ہی اپنے کھلونے بنا رکھے تھے۔ جیسے لوہے کی تار سے سائیکل کے پہیے کو تیزی سے چلانا۔ کبھی کبھار یہ پہیے راہگیروں کے پاؤں پر بھی چڑھ جاتے تھے۔ کھڑکی سے چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بھی دکھائی دیتی تھیں جو ویسی ہی آزاد تھیں جیسی وہ خود کبھی ہوا کرتی تھی۔ غالباً ان کی شادیاں بھی سن بلوغت کے پہنچنے کے فوراً بعد ہوں گی اور وہ بھی اس کی طرح پابند ہو جائیں گی۔ یہ لڑکیاں اسے اس کا حالیہ ماضی، شادی، حال اور مستقبل یاد دلاتی تھیں۔ اسے ساتھ والی ریکارڈوں کی دکان سے بجنے والی موسیقی سننا بھی اچھا لگتا تھا۔ کبھی کبھار تو گلی کا شور اور ہارنوں کی آوازیں بھی ناگوار نہ گزرتی تھیں۔ پھول بیچنے والے بوڑھے کی خوشبو اس تک پہنچتی۔ پھر وہ عجیب وغریب بوڑھا جو کم وبیش روز ہی گزرتا تھا۔ کبھی مسکراتا ہوا اور کبھی ناراض ناراض سا۔ اور وہ شرابی۔ ہر شے سے وہ آشنا ہو چکی تھی۔ سب چیزیں اس کی کائنات کا جزو بن چکی تھیں۔ فالتو وقت میں وہ ریڈیو سے دل بہلاتی۔ موسیقی سے اسے حد درجہ لگاؤ تھا۔ خصوصاً ایسی موسیقی کو وہ ترجیح دیتی جو رقص کی ترغیب دے۔ وہ خبریں بھی سنتی جو ایسی دنیا سے متعلق لگتیں جس سے اب اس کا کوئی ناتہ نہ رہا تھا۔ جو دور بہت دور تھی۔ بعض پروگرام، بعض مباحثے۔ ہر دلچسپ شے سے دور ہونے کا اس کا احساس اور بھی بڑھا دیتے۔ مقررین اسے ایسی سوسائٹی سے متعلق ہونے کا تاثر دیتے جو اس کی نہ تھی۔ آخر ان کے موضوع بحث سے اسے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی کہ اس کا مقدر تو سماجی زندگی میں شریک ہوئے بغیر اور اپنی پسند کا پیشہ اختیار کیے بغیر اس کمرے میں زندگی بسر کرنا تھا۔ اکثر اوقات عورتوں کے بارے میں بھی مباحثے ہوتے لیکن اس کے کسی مسئلے کا تذکرہ نہ ہوتا۔ وہ ان باتوں کا اپنی زندگی سے موازنہ کرنے سے قاصر تھی۔ اسے کوئی ایسی بات نہ ملتی جسے وہ اپنی موجودہ زندگی کو بدلنے میں استعمال کر سکے۔ وہ اکثر اوقات آزادی نسواں کی بات کرتے لیکن آزادی کا چرچا کرنے سے پہلے انہیں کسی عورت کو سننے کے قابل تو ہونا چاہیے جو پکار پکار کر کہتی ہے کہ میں آزاد نہیں ہوں لیکن آزاد ہونا چاہتی ہوں۔ ''آزادی مجھے تم سے اتنا ہی پیار ہے جتنا اپنے لخت جگر سے۔'' جنگ آزادی کے دنوں میں ایک خاتون نے یہ نعرہ لگایا تھا۔ ہاں اس زمانے میں وہ یہ نعرہ لگا سکتی تھیں۔ لیکن اب؟ کوئی عورت نقاب کے بغیر باہر نہیں جا سکتی کیونکہ اس کے گھر والوں

نے منع کر رکھا ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ تنہا نہیں رہ سکتی کیونکہ رواج اس کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ گھر سے باہر کام نہیں کر سکتی کیونکہ...... بار بار فائزہ ان باتوں پر غور کرتی۔ اس کی حالت پنجرے میں بند نو گرفتار پرندے جیسی ہوئی جا رہی تھی۔ روز بروز اس کی جسمانی تکلیف بڑھتی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ خوراک کم سے کم ہوتی گئی۔

''اپنے آپ کو سنبھالو۔ بچے کی خاطر اپنے آپ کو سنبھالو۔''

عائشہ چوکس ہو چکی تھی۔ وہ کوئی یقینی علاج ڈھونڈنا چاہتی تھی۔

''جب وہ اپنے میاں کو ہی یہاں نہیں رکھ سکی تو اچھی ماں کیونکر ثابت ہو گی اور خدایا۔ ہم کیا کریں؟''

فائزہ کمرے میں تھی جب اس نے اپنی سہیلی مریم کو گلی میں آتے دیکھا۔ اس نے بھاگ کر سامنے والا دروازہ پوری طرح کھول دیا۔ دونوں سہیلیاں شدت جذبات سے ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئیں۔ عائشہ نے انہیں دیکھا تو تیزی سے آگے بڑھی۔ مریم نے اسے سلام کیا۔

''آؤ۔ آؤ۔''

مریم عائشہ کے پیچھے چلنے لگی۔ فائزہ چڑ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ ساس ان دونوں کو اکیلے مل کر نہ بیٹھنے دے گی۔ مریم نے ثمینہ اور دوسرے بچوں کو بھی گلے لگایا۔

''بیٹھ جاؤ۔''

مریم بیٹھنے والی تھی کہ فائزہ اسے بازو سے پکڑ کر اپنے کمرے کی طرف لے گئی۔ ملامت آمیز نگاہوں سے عائشہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

''آؤ مریم آؤ۔ میں نے تمہیں بہت سی چیزیں دکھانی ہیں۔ وہ سب میری شادی کے تحفے۔''

''معاف کیجیے گا'' مریم نے مسکراہٹ کے ساتھ عائشہ سے کہا۔

وہ فائزہ کے پیچھے چلنے لگی۔ ثمینہ فائزہ کے رویے کو پوری طرح سمجھ رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر بچوں کو روکا جو دونوں کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ برہمی کے عالم میں بڑبڑاتی ہوئی عائشہ صحن کی طرف نکل گئی۔

جونہی دروازہ بند ہوا فائزہ نے مریم کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اس کی طرف دیکھا

اور ہنسنے لگی۔

''شاید ہم نے زیادتی کی ہے۔لیکن کوئی اور راہ نہ تھی۔ وہ ہمیں ایک منٹ کے لیے بھی تنہا نہ چھوڑتی۔ اس کی عادت ہی یہی ہے۔تمہیں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے لیکن تم نے آنے میں اتنی دیر کیوں کی؟''

''میں تو دو بار آئی تھی۔لیکن تمہاری ساس یہ کہہ کر ٹال دیتی کہ تم اپنے میاں کے ساتھ باہر گئی ہو۔''

''کیا؟ میں نے تو باہر قدم نہیں نکالا۔ ہاں بس ایک بار جوتے خریدنے گئی تھی۔ یادگار دن۔ ہارون نے مجھے برقع پہننے اور ویسے ہی اس کے پیچھے چلنے پر مجبور کیا جیسے شاید اس کی دادی اس کے دادا کے پیچھے چلا کرتی تھی۔''

مریم اور فائزہ دونوں ہنسنے لگیں۔

''میں تمہاری موجودگی کی وجہ سے ہی ہنس رہی ہوں ورنہ میں طیش کی آگ میں جل رہی ہوں۔''

''میں نے بھی آج دھکا دے کر اندر آنے کا ارادہ کر لیا تھا۔''

''اچھا تو تمہیں میرے متعلق کوئی پریشانی تھی؟ میں تمہیں دیکھنے کو مری جا رہی تھی۔''

''مادام سوسی نے تمہیں پیار پہنچایا ہے۔ فاطمہ اور عذرا نے بھی۔ جانتی ہو ہم تمہارے متعلق بہت سی باتیں کرتی ہیں۔''

''بہت شکریہ مریم۔انہیں بھی میرا پیار اور آداب دینا۔ بھولنا نہیں۔لیکن تم جانو سکول تو مجھے اتنا دور لگتا ہے، اتنا دور۔''

دونوں خاموش بیٹھی تھیں۔ مریم نے اپنی سہیلی کی طرف دیکھا تو وہ بدلی ہوئی، زرد اور کمزور دکھائی دی۔

''مریم میں خوش نہیں ہوں۔''

مریم نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''میں سوچتی تھی کہ ہارون فرانس میں رہ چکا ہے، اس لیے وہ اس قدر ماڈرن اور فراخدل ضرور ہوگا کہ ہم ایک دوسرے سے باتیں کر سکیں ایک دوسرے کو سمجھ سکیں۔مل کر اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی کے متعلق فیصلے کر سکیں۔لیکن نہیں وہ تو روایت کا مارا

ہے۔شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مسائل سے بچنا چاہتا ہے اور شاید اس لیے بھی کہ وہ کسی شے کی پروا نہیں کرتا۔ اسے کوئی احساس ہی نہیں ہے۔ مجھے یہاں چھوڑ کر اب وہ فرانس چلا گیا ہے۔کسی وجہ کے بغیر اس نے مجھے تھپڑ مارا اور پھر معذرت بھی نہ کی۔کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ اگر ہم علیحدہ کسی گھر میں رہیں تو شاید اس کا رویہ بدل جائے۔ وہ اس قدر عجیب ہے۔ بہت کم بولتا ہے۔گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ ہوتا ہے۔''

''تم کتنی بدل گئی ہو فائزہ۔''

''ہاں مریم۔تم ہرگز ایسی شادی نہ کرنا۔ ایسا ہونے سے پہلے ہی مقابلہ کرنا۔ بعد میں کچھ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔''

''تم واقعی کس قدر بدل گئی ہو۔''

''ہاں میں بہت بدل گئی ہوں۔ میرے اندر بغاوت کی آگ روشن ہے اور میری ساس کو اس کا خوب احساس ہے۔ اس کی چھٹی حس بہت تیز ہے۔ ہر وقت میری نگرانی کرتی ہے۔ مجھ سے وہ نالاں ہے۔ وہ اپنے بیٹے کی بیوی پر، اپنے پوتے کی ہونے والی ماں پر کڑی نظر رکھتی ہے۔ اگر میں اس کی سنوں، ماں کی طرح اس کی بات مانوں تو پھر اس سے اچھا کوئی نہ ہوگا۔ دیکھنا تم ابھی وہ اندر آ جائے گی۔ مجھے پکا یقین ہے۔''

''اس میں کوئی شبہ نہیں۔ ہماری نگرانی تو ہر وقت ہوتی ہے۔سکول میں ایک واقعہ ہو گیا ہے۔ جمیلہ اور فاطمہ جمیلہ کے کزن عبدہ اور اس کے دوست عمر کے ساتھ جا رہی تھیں۔ پولیس نے انہیں روکا۔ شناختی کارڈ ان کے پاس نہ تھے اس لیے پولیس والے انہیں تھانے لے گئے۔ ذرا اندازہ کرو۔کوئی باہر نکلے اور طوائف ہونے کے شبے میں دھر لیا جائے۔ کس قدر عجیب بات ہے۔لڑکوں کا کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ آزادی سے ہر جگہ گھوم پھر سکتے ہیں اور کوئی انہیں نہیں پوچھتا۔ان کے والدین کے حال کا تو تم اندازہ کر سکتی ہو۔ ہاں انہیں مارا پیٹا گیا۔تھانے میں۔''

دروازہ کھلا اور عائشہ اندر داخل ہوئی۔

''آؤ بھئی کافی تیار ہے۔''

چوری سے فائزہ اور مریم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرا دیں۔

''ہم ابھی آتی ہیں۔ بس ابھی۔'' فائزہ نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

MashalBooks.com

عائشہ چلی گئی اور اس کے جاتے ہی فائزہ ہنسنے لگی۔

''چند منٹوں کے لیے ہمیں اکیلے چھوڑنا اس کے بس سے باہر ہے۔ مگر اب تم اکثر آیا کرو گی۔ آؤ گی نا؟ پھر وہ اس بات کی عادی ہو جائے گی۔ اندر آنے سے پہلے کھڑکی پر دستک دے دیا کرو۔ اس طرح میں خود آ کر دروازہ کھولا کروں گی۔ اس طرح وہ تمہیں جواب نہ دے سکے گی۔''

''وعدہ کرتی ہوں میں پھر آؤں گی۔''

اس روز دونوں سہیلیاں زیادہ دیر تک گھل مل کر باتیں نہ کرسکیں۔ وہ ایک دوسرے سے جلد از جلد ملنے کا وعدہ کر رہی تھیں تو عائشہ بھی ان کی ملاقاتوں کو کم کرنے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھانے کا فیصلہ کر رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ابھی فائزہ نئے گھر میں اس قدر رچ بس نہیں گئی کہ اسے بچپن کی کسی سہیلی سے ملنے دیا جائے۔

اس بات پر اسے بہت پریشانی تھی کہ فائزہ آسانی سے گھل مل نہیں سکی۔ ایسی چند اور دلہنوں کو عائشہ جانتی تھی لیکن وہ سب وقت کے ساتھ بدل گئی تھیں۔ اسے قطعاً احساس نہ تھا کہ اس کے اپنے گھر میں ایسی کوئی بات ہوسکتی ہے۔ واقعی وہ اس کے سزاوار نہ تھے۔ ایک بات کا اسے پختہ یقین تھا: ایسی صورت حال میں الگ تھلگ رکھنا ہی موثر علاج ہے۔ پھر کون عورت ہے جسے اپنا نیا گھر قبول نہیں کرنا پڑتا؟ آخر اسے بھی تو اپنے سسر کے رعب داب اور ساس کی بدمزاجی کے آگے جھکنا پڑا تھا۔ یہی زندگی ہے۔ عائشہ اپنے تئیں بے ضرر خیال کرتی تھی اور یہ بھی سمجھتی تھی کہ گھر کے معاملات کو ٹھیک طور پر چلانے کے لیے اس کے شوہر کی برتری ناگزیر ہے۔ ہونا بھی ایسا ہی چاہیے۔ خطرناک قباحتوں کے لیے وہاں کوئی جگہ نہ تھی۔ عورت کی، ماں کی خوشی کا انحصار ان باتوں پر ہے۔ خوشی - کیا خود اسے خوشی ملی تھی؟ وہ خود سے یہ سوال نہ پوچھتی تھی۔ بس وہ زندہ رہتی اور زندگی میں اچھائیاں ہیں۔ برائیاں بھی۔ وہ مشکل ہے آسان بھی۔ حقیقت ہے اور وہم بھی۔ محبت، موت۔ ہاں۔ زندگی میں یہ سب کچھ ہے۔ تعریف ہو خدا کی۔ سخت ترین زمانے سب گزر چکے تھے۔ وہ زمانے جب ہر لمحہ اپنے پیاروں پر ظلم، تشدد اور موت کا خوف رہتا تھا۔ رنج و الم کے ایسے لمحوں میں وہ خدا سے رجوع کرتی، اس سے التجائیں کرتی، دعائیں مانگتی۔ لیکن یہ جوان لوگ؟ لگتا ہے کہ وہ صرف خود پر انحصار کرتے ہیں۔ رسم دعا انہیں یاد نہیں رہی۔

MashalBooks.com

عائشہ کو یقین تھا کہ اس کی بڑی بہو کو حقیقی عورت بننا چاہیے۔ اور حقیقی عورت وہ ہوتی ہے جو اس جیسی ہو۔

شام خوبصورت اور پرسکون تھی۔ فائزہ نے صحن کا چکر لگایا۔ وہ ایک بڑے سے نقاب کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اسے منہ پر رکھتی، اتارتی، سکارف کی طرح تہہ کرتی اور پھر لہراتی۔ اس نے انجیر کے درخت کا چکر لگایا جو راتوں کو زیادہ پراسرار دکھائی دیتا تھا۔ اس نے درخت کے ایک بڑے پتے کو چوما۔ گھر کے لوگ بیٹھک میں ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے۔ فائزہ کو اس کی آواز آ رہی تھی۔ گرم ہوا کا ایک جھونکا آیا تو سنگترے کے درختوں اور کافی کی بھینی خوشبو آنے لگی۔

''ہمارے ساتھ تم ٹی وی کیوں نہیں دیکھتیں؟''

عائشہ کی آواز پر وہ اچھل پڑی۔

''میں تھوڑا سا چلنا چاہتی ہوں، تازہ ہوا میں۔''

''اندر آؤ۔''

''میں تھوڑا سا چلنا چاہتی ہوں، تازہ ہوا میں۔''

''میں کہتی ہوں کہ اندر آؤ۔ ٹھنڈ لگ جائے گی۔ صرف اپنا ہی نہ سوچو۔''

فائزہ یوں چلتی رہی جیسے اس کی ساس نے کچھ نہ کہا ہو۔ بڑبڑاتی ہوئی عائشہ اندر چلی گئی۔ فائزہ کے دل میں دروازے سے نکل کر باہر گلیوں میں اکیلے گھومنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ پھر اچانک دائروں میں گھومنے سے تھک کر وہ نیچے بیٹھ گئی۔

عائشہ اسے اندر لے جانے کا پختہ ارادہ کر کے دوبارہ آئی۔

''تم کیا کر رہی ہو فائزہ؟ کیا واقعی تم رات کے وقت یوں باہر رہ کر بیمار ہونا چاہتی ہو؟'' کچھ کہے بغیر فائزہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

دونوں عورتوں کے درمیان خاموشی محض اسی وقت ٹوٹی جب وہ چند منٹوں کے لیے کھانے پکانے اور صفائی کرنے جیسے گھریلو امور پر بات کرتیں۔

دوسرے روز دوپہر کے قریب ڈاکیہ فرانس سے آنے والا منی آرڈر لے کر آیا۔ عائشہ بھاگی ہوئی گئی اور فائزہ کو دستخط کرنے کے لیے کہا۔

''شکریہ بیٹا۔ شکریہ۔''

MashalBooks.com

پھر وہ مٹر کے دانے نکالنے کے لیے باورچی خانے میں واپس آ گئی۔ مٹر۔ ہر وقت مٹروں کی بھرمار ہی رہتی۔ فائزہ پہلے ہی کافی دانے نکال چکی تھی۔ اور اب جب کہ تینوں مجبوراً ایک جگہ بیٹھی تھیں، عائشہ نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سبق آموز کہانیاں سنانی شروع کر دیں۔ لیکن اس کے ذہن پر منی آرڈر چھایا ہوا تھا۔

''ہارون پیسے ضرور بھیجتا ہے۔ وہ بہت اچھا بیٹا ہے اور اچھا شوہر بھی۔ لیکن اس نے خط تو لکھا ہی نہیں۔ بڑی عجیب بات ہے۔ شاید کل تک کوئی مل جائے۔ ہائے وہ پھر کیوں چلا گیا؟ ہمارے بچوں کو کیوں اس طرح پردیس میں جلاوطن ہونا پڑتا ہے؟''

فائزہ فوراً اٹھ کر چلی گئی۔ اب وہ اپنی ساس کے مزید بین اور اشارے برداشت کرنے کے قابل نہ تھی۔ اس نے مٹر گرا دیے اور انہیں اٹھانے کی کوشش بھی نہ کی۔

''کیا عجیب عورت ہے۔ واقعی ہم سے غلطی ہوئی۔ زندگی دوبھر ہو جائے گی۔ ثمینہ میں چاہتی ہوں کہ تم اس جیسی نہ بننا۔ سنا تم نے؟ مٹر اٹھاؤ۔ کاش ہارون یہیں رہتا۔''

فائزہ کو البتہ یقین تھا کہ ہارون یہاں رہتا تو بھی حالات ایسے ہی رہتے۔

اس شب کمرے میں اکیلی بیٹھ کر اس نے سوچا کہ اس کی زندگی اب کسی طور بدل نہیں سکتی۔ اب تو وہ خود کو بھی پہچان نہ سکتی تھی۔ کبھی وہ ڈھیروں باتیں کیا کرتی تھی۔ لیکن اب جیسے ہونٹوں پر مہر لگ گئی ہو۔ پہلے اسے کبھی غصہ نہ آیا تھا اور اب سارا دن وہ غصے کے عالم میں رہتی زندگی سے اسے پیار ہوا کرتا تھا اور اب وہ اس سے بے زار تھی۔ یہاں تک کہ اس کے پیٹ میں پرورش پانے والا بچہ بھی اسے متوجہ نہ کر سکا تھا۔ بس ایک بوریت، تشویش، الجھن، تنہائی اور بغاوت کا احساس چھایا رہتا۔ بغاوت جسے وہ سمجھے بغیر محسوس کرتی تھی اور جس کا کوئی کنارہ اسے دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس کا سر چکرانے لگا اور سانس پھول گیا۔ وہ بستر پر لیٹ گئی اور سارے کپڑوں سمیت سو گئی۔ کمرے کی تمام روشنیاں جل رہی تھیں۔ آدھے گھنٹے بعد عائشہ نے اسے جگایا۔

''اس طرح سونے کا کیا مطلب ہے۔ اور یہ روشنی کیوں؟''

فائزہ نے کروٹ لی۔

''ہاں واقعی ہمیں اس کی ہر وقت نگرانی کرنی ہے۔ بیٹا جب تم واپس آ ؤ گے تو خدا کی قسم تمہیں حقیقی بیوی ملے گی۔''

نیند سے بوجھل فائزہ دوبارہ سوگئی۔ دوسری صبح اسے دیکھتے ہی عائشہ نے کہا

''فائزہ رات تم نے روشنی بند نہیں کی۔تم تو بالکل بچہ بن گئی ہو۔''

فائزہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔لیکن خاموش رہی۔ اس نے گزشتہ شام کے واقعات یاد کرنے کی کوشش کی۔لیکن اس لمحے سب کچھ دھندلا تھا۔آخر اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے؟

ماں اور بہن کا تیار کیا ہوا ناشتہ کھاتے ہوئے جمال فائزہ کو دیکھ کر مسکرایا۔ دونوں کی نظریں ٹکرائیں لیکن فائزہ نے کوئی مسکراہٹ نہ دی۔ وہ کہیں اور کھوئی ہوئی تھی۔ وہ اس کے لیے بڑی ہمدردی محسوس کرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ خوش نہیں ہے۔ وہ حالات کو بدلنے کی خواہش تو کرتا، لیکن خواہش کے باوجود تبدیلی آسانی سے نہیں آیا کرتی۔ اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ اس لیے اس کی کوششیں مفید ہونے سے زیادہ بھدی ہوتی تھیں۔ شاید وہ جواں سال بھابھی کے لیے ہمدردی کے علاوہ بھی کوئی جذبہ محسوس کرتا تھا۔ بلاشبہ اس کے رویے کے پیچھے فائزہ کی مدد کرنے اور اس پر مسلط کی جانے والی ہر شے کو چیلنج کرنے کی شدید خواہش کارفرما تھی۔ چھوٹی بہن ثمینہ پر مسلط کی جانے والی چیزیں اس میں بغاوت کا جذبہ کم ابھارتی تھیں۔ رواج کے مطابق اپنی خدمت کروانا اسے ناگوار گزرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ خواب میں خود کو ایسے سپرمین کے روپ میں دیکھتا جو سب کچھ کرسکتا ہے اور چند لمحوں میں جیمز بانڈ کا منظرنامہ تخلیق کرسکتا ہے۔ لیکن حقیقت کی دنیا میں ایسے خوابوں کی افادیت کے لیے کم ہی جگہ ہوا کرتی ہے۔ مایوسی کے احساس کے ساتھ اسے حقیقی زندگی میں واپس آنا پڑتا۔

''بھلا یہ کیا فلم ہے جو ٹی وی پر جمعرات کی شام کو دکھائی جائے ثمینہ تم بچوں کو بستر پر لٹا دیتیں۔ یہاں بیٹھے بیٹھے تو وہ تھک گئے ہیں۔ فلم تو بالکل ہی واہیات ہے۔''

ماں کا کہنا ماننے والی ثمینہ ہچکچائی ہوئی اٹھی اور سوئے ہوئے علی کو اٹھانے کے بعد نفیسہ کو لینے آئی۔

''میرے خیال میں تو یہ فلم بہت اچھی ہے۔'' جمال نے یہ بات محض احتجاج کے طور پر کہی۔ کیونکہ اس امریکی فلم میں واقعی کوئی بات دیکھنے کے قابل نہ تھی۔

''ہاں تم یقیناً یہی کہو گے۔تم نہ کہتے تو مجھے تعجب ہوتا۔''

MashalBooks.com

احمد نے بیٹے کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ اس کی گہری دلچسپی کا حقیقی سبب تلاش کر رہا ہو اگر کوئی تھا تو۔

''یقیناً، کیوں؟ میں سب فلموں کو تو پسند نہیں کرتا۔'' احمد اٹھ کر کمرے سے چلا گیا۔ ''ٹی وی تمہیں خراب کر رہا ہے اور تمہیں اس کا احساس بھی نہیں ہے۔'' شوہر کی شہہ پا کر عائشہ نے ٹی وی بند کر دیا اور خود بھی کمرے سے نکل گئی جمال نے ہنستے ہوئے ٹی وی پھر آن کر دیا۔ اس نے فائزہ کی طرف دیکھا جو اپنی جگہ پر بیٹھی تھی جیسے کوئی بات نہ ہوئی ہو۔

''یہ فلم واقعی اچھی نہیں ہے۔ اس میں کسی واقعہ کے رونما ہونے سے پہلے ہی اس کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ زندگی تو اس قدر سادہ نہیں ہے۔''

''نہیں- زندگی اس قدر سادہ نہیں۔''

فائزہ جمال کو دیکھ کر مسکرائی۔ وہ اس کی وہاں موجودگی پر اس کے مختلف ہونے اور احتجاج کرنے کے قابل ہونے پر اس کی ممنون تھی۔

''فلم سے وقت بیت جاتا ہے۔ وہ تھوڑا سا چیزوں کو بدلتی بھی ہے۔ اچھی نہ ہو تو بھی انسان کو بہت سی چیزوں کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ سب زندگیوں سے اس قدر مختلف ہے کہ بعض اوقات یوں لگتا ہے جیسے ہم خواب دیکھ رہے ہوں اور پھر جب کوئی میری طرح یوں بند ہو۔

''ٹی وی دوبارہ کس نے لگایا ہے؟'' کمرے میں داخل ہوتے ہوئے عائشہ نے پوچھا۔

''میں نے۔ ہم کم از کم آخر تک فلم تو دیکھ سکتے ہیں۔ نہیں؟ اگر وہ اسے ٹی وی پر دکھا سکتے ہیں تو ہم دیکھ بھی سکتے ہیں۔ ٹھیک ہے؟''

بیٹے کو منع نہ کر سکنے پر عائشہ نے فائزہ کی طرف رخ کیا۔

''فائزہ دیر ہو رہی ہے۔ اب سو جاؤ۔ کل پھر تھکاوٹ کی شکایت کرو گی۔''

فائزہ اٹھی اور خاموشی سے کمرے سے نکل گئی۔

''کیا حرج تھا اگر وہ آخر تک فلم دیکھ لیتی۔''

''اپنے کام سے کام رکھو۔''

''اپنے کام سے کام رکھوں؟''

MashalBooks.com

بڑے بھائی نے بھی اسے یہی مشورہ دیا تھا ''ہاں۔لیکن آخر میرا کام ہے کیا؟ ہمارا کام کیا ہے؟'' اسے تعجب ہوا اور شوہر کے پاس اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جمال کو جب یقین ہو گیا کہ ماں اپنے کمرے میں جا چکی ہے تو اس نے فائزہ کے دروازے پر ہولے سے دستک دی۔ اس نے تھوڑا سا دروازہ کھولا اور دیور کو وہاں دیکھ کر حیران ہوئی۔

''فائزہ، میرے پاس چند کتابیں اور اخبار ہیں، اگر تمہیں پسند ہوں؟''

''ارے ہاں مگر آج کی رات نہیں۔کل سہی جمال۔ بس تمہاری ماں کو پتہ نہ چلے۔''

''میں جانتا ہوں، جانتا ہوں۔تم فکر نہ کرو۔اسے پتہ نہیں چلے گا۔شب بخیر۔''

وہ چپکے سے لوٹ آیا۔

MashalBooks.com

چند روز کے بعد فائزہ نے چھوٹی نند کو چوری چھپے پڑھانے کی پیش کش کی کیونکہ عائشہ کو یہ بات پسند نہ تھی۔ ثمینہ جان گئی۔ اسے لکھنا پڑھنا سیکھنے کا بے حد شوق تھا مگر ماں کی ناراضی کا ڈر بھی تھا۔ فائزہ نے مکمل طور پر چوکس رہنے کا یقین دلایا اور جمال نے بھی مدد کرنے کی حامی بھری۔ وہ بھی اس راز میں شامل تھا۔ انہوں نے فوراً یہ کام شروع کر دیا۔ ثمینہ اپنی لگن اور دلچسپی کی بنا پر تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ اسی اثنا میں ان کی دوستی بڑھتی گئی اور وہ زیادہ کھلے طور پر اس کا اظہار بھی کرنے لگیں۔

''کاش میں بھی تمہاری طرح سکول گئی ہوتی۔''

''تم دیکھ ہی رہی ہو کہ اس کا کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہوا۔''

''ارے نہیں، ہوا ہے۔ پڑھنا لکھنا آتا ہو تو ہر شے بدل جاتی ہے۔''

فائزہ نے سوچا کہ ثمینہ درست ہی کہتی ہے۔ ہر شے بدل جاتی ہے۔ اب جب کہ جمال اسے کتابیں اور اخبارات فراہم کرنے لگا تھا، اس کی زندگی کا جبر بھی قدرے کم ہو گیا تھا۔

''تم پڑھنا سیکھ جاؤ گی۔''

''واقعی؟''

''یقیناً۔ تم خود دیکھ سکتی ہو۔ تیزی سے سیکھ رہی ہو۔''

اپنی ننھی منی سازش کو انہوں نے منظم کیا۔ طے یہ پایا کہ لکھنے پڑھنے کے معاملے کو سینے پرونے کے کام کے پردے میں جاری رکھا جائے۔ عائشہ چاہتی تھی کہ وہ اس کی بیٹے کو سینا پرونا سکھا دے کیوں کہ یہ کام ناگزیر تھا اور اس معاملے میں جتنا کچھ بھی آتا ہو اچھا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی بیٹے کو فائزہ کے اثر سے بچانا بھی چاہتی تھی۔ ظاہر

ہے کہ یہ ایک بڑا تضاد تھا۔ لیکن عائشہ ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے خود کو ان تضادات میں پھنسنے نہ دیتی تھی جن سے وہ نمٹ نہ سکے۔

خیر سینے پرونے کے کام کی تربیت عائشہ کی اجازت سے شروع ہوگئی۔

ان تمام باتوں نے جمال کے ساتھ نئے ربط، چھوٹی نند کے ساتھ مضبوط تر دوستی اور عائشہ کے ساتھ آنکھ مچولی کے کھیل نے زندگی کی اکتا دینے والی یکسانیت اور خلا کو کم کر دیا اور فائزہ ان سے لطف اندوز ہونے لگی۔ عائشہ لکھنے پڑھنے کے علم کی مخالف نہ تھی۔ البتہ اسے عورتوں پر اس علم کے نتائج اچھے نہ لگتے تھے۔ فائزہ اب علت و معلول کے ان خود ساختہ ناتوں کو مکمل طور پر سمجھنے لگی تھی جن میں اس کی ساس یقین رکھتی تھی اور دنیا کی کوئی طاقت اسے ان سے برگشتہ نہ کر سکتی تھی۔ اس کے ہر فعل ہر اختیار یہاں تک کہ اس کی تشویش اور غصے کا تعلق بھی خاندان کو صدیوں پرانے رسم و رواج کی راہ پر گامزن رکھنے کی شدید خواہش سے تھا۔

''ماں ہمیشہ کہتی ہے کہ سکول جانے سے لڑکیاں مغرور اور ناقابل برداشت بن جاتی ہیں۔''

''تمہاری ماں تو اصل میں کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتی۔ خوش قسمتی سے اس کی نسل کی تمام عورتیں ایسی نہیں ہیں۔''

وہ ہنستیں اور خفیہ سبق جاری رہتا۔ ہلکی سی مشکوک آواز آنے پر بھی وہ کتابیں، کاغذ اور قلمیں چھپا لیتیں اور ان کی جگہ سوئی دھاگہ کا کام شروع کر دیتیں۔

سینے پرونے کے کام نے ممنوعہ اسباق کو پوری طرح چھپا لیا تھا۔

جمال نے انھیں چند ابتدائی قاعدے لا دیے تھے اور ثمینہ نے تیزی سے کام شروع کر دیا تھا۔ اس کی پھرتی میں فخر کا ہلکا سا احساس بھی شامل تھا۔ اسے فائزہ کی تعریفیں اور بھائی کی طرف سے حوصلہ افزائی پسند تھی لیکن ان سے بھی زیادہ اسے یہ ذہنی کام پسند تھا جس کے دروازے اس پر بند رکھے گئے تھے۔ اس پڑھنے لکھنے کے کام میں بڑا لطف آتا اور وہ آئندہ زیادہ لطف کی منتظر تھی۔ ماں کی نافرمانی اور اسے ناراض کرنے کے خدشے بھی لطف سے خالی نہ تھے۔ یہ تمام متضاد احساسات اور تاثرات جو اسے زیادہ پیچیدہ کائنات کی طرف لا رہے تھے۔ اس پر گراں نہ گزرتے۔

اخبار میں مگن جمال کا سامنا باپ سے ہو گیا۔ احمد نے پیار سے بیٹے کے رخسار پر تھپکی دی۔

''اچھا۔ ہم پھر ہار گئے؟ چار کے مقابلے میں ایک۔ کوئی اچھی بات نہیں۔'' وہ ہنسا۔

''خیر، تم کیا توقع کرتے ہو؟''

''یہ ہونا ہی تھا۔''

جمال ہنسا اور باپ کو جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔ خدا جانے اس نے یہ بات سنجیدگی سے کہی تھی یا مذاق میں۔ یا یہ محض اتفاق تھا۔ ہاں۔ لیکن اس کے باپ کے لیے نہیں جو ہمیشہ ''مقدر کے لکھے'' سے مکمل طور پر باخبر دکھائی دیتا تھا۔ اچھا تو پھر ہارون کا جانا بھی۔ 'لکھا' تھا؟ اور یہ کہ وہ 'جمال' اس سے اتفاق نہ کرے بھی 'لکھا' تھا؟ جبر و قدر کے اس مسئلے پر سوچ بچار میں عائشہ نے رکاوٹ پیدا کی۔

''تم پھر ان فضول باتوں میں کھو رہے ہو۔ ہم جانتے ہیں ان کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔''

جمال جو کافی خوش تھا، ہنسنے لگا۔ اسے ماں کے جانے کا انتظار تھا تاکہ وعدے کے مطابق فائزہ کو کتاب اور اخبار دے سکے۔ اس نے دروازے پر دستک دی اور چھپ کر اندر داخل ہو گیا۔ فائزہ اور اس کی بہن بستر پر دراز تھیں۔ ثمینہ نے فائزہ کے پیٹ پر کان لگا رکھے تھے۔ اس کے زرد اور ستے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ عجیب سی لگ رہی تھی۔ ثمینہ اٹھ بیٹھی۔

''ہاں۔ ہاں۔ میں نے سنا ہے۔ وہ ہل رہا ہے۔''

اس نے تالیاں بجائیں اور خوشی سے اٹھ کر رقص کرنے لگی۔ لڑکا یا لڑکی؟ لڑکا؟ لڑکی؟ وہ گنگنائی اور پھر اچانک اس نے دروازے میں حیرت کا مجسمہ بنے ہوئے جمال کو دیکھا۔ وہ رک گئی۔ فائزہ ہنستے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی۔ اب اس نے بھی دروازے کی طرف نظریں کیں جس کے کھلنے کی آواز نہ آئی تھی۔ وہاں اس نے بے حس و حرکت جمال کو دیکھا جو عورت کے بھید کی دہلیز پر کھڑا اس قدر متاثر ہوا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آنے ہی کو تھے۔ فائزہ نے جلدی سے وہ اخبار اور کتاب لے لی جو وہ لے کر آیا تھا۔

''جمال فوراً چلے جاؤ۔ تمہاری ماں نے ہم تینوں کو یہاں دیکھ لیا تو۔ جلدی

جاؤ۔اور ہاں شکریہ۔''

وہ جمال پر مسکرائی اور وہ ماں کے خوف سے زیادہ اپنے اس نا قابل بیان اور پسندیدہ جذبے سے مغلوب ہوکر فوراً باہر نکل گیا۔

صبحیں تو گھر کے کام کاج میں گزر جاتیں۔لیکن دوپہریں اکثر بوجھل اور طویل ہوتی تھیں۔ جب اس کی ماں گھر میں دوستوں کو بلاتی تو فائزہ اور اس کے بھائی بہنوں کے لیے یہ واقعی ایک تقریب ہوتی۔بچپن سے فائزہ انہیں جانتی تھی۔ پھر تھوڑا سا کیک زیادہ کھانا بھی تو ایک واقعہ ہی ہوتا تھا۔لیکن یہاں،سسرال میں اس قسم کی تقریبات میں وقت کٹ جاتا تھا لیکن فائزہ کو لطف کبھی نہ آیا تھا۔ عائشہ عورتوں کی ان چھوٹی چھوٹی پارٹیوں،سہ پہر کی ان دعوتوں کی دلدادہ تھی۔گپ شپ میں اسے اپنے غم بھول جاتے تھے طویل سلام دعا سے لے کر ہر شخص اور ہر شے کے بارے میں اچھی بری خبریں اسے اچھی لگتی تھیں۔عورتیں خوشبوؤں، بناؤ سنگھار، روشنی،تمسخر آمیز قہقہوں، زندگی میں پر جوش شرکت،محبت،موت اور بہت سے دوسرے بھیدوں کی امین ہوتی ہیں۔ وہ بغض، حسد، کمینگی اور توہمات کی حامل بھی ہوتی ہیں، جو محض نسوانی نہیں بلکہ ایک محدود دائرے میں گھومنے والی روایتی زندگی کے نتائج ہیں۔ عائشہ مزے لے لے کر دوسروں کے قصے سنتی جو بھرپور اداکاری کے ساتھ سنائے جاتے تھے۔ پڑھنے کے علم کا فائدہ ہی کیا ہے۔اگر قصے اس قدر خوبی سے سنائے جاسکتے ہیں۔زندگی کا کھیل کتابوں میں کھیلا نہیں جاتا۔ بیان ہوتا ہے۔اس کی ایک پرانی سہیلی بیان کرنے سے زیادہ گپیں ہانکنے کی ماہر تھی۔لیکن اس کے بغیر گزارہ بھی نہ تھا۔وہ سب کچھ جانتی تھی اور جو کچھ اسے معلوم نہ ہوتا وہ خود ہی گھڑ لیتی۔ ہر ہفتے کی گپوں اور افواہوں کو اس سے سنا جاتا۔قصائی کی بیوہ کے تازہ ترین کارنامے جسے صرف اپنے آپ میں دلچسپی تھی۔ انور کے بیٹے کی تازہ خبر جسے حال ہی میں ایک سرکاری کمپنی میں اچھی ملازمت ملی تھی اور اب اسے بیوی کی تلاش تھی۔رضیہ کی بیٹی کی نئی اطلاع جس نے شادی سے انکار کر دیا تھا اور اب اسے باپ اور بھائیوں نے کمرے میں بند کر رکھا تھا۔اس کے ساتھ ساتھ نواز کے بڑے بیٹے کی کرتوتیں جس نے ڈاکے کی سزا بھگتنے کے بعد جیل سے باہر نکلتے ہی گزشتہ ہفتے کسی کو تقریباً قتل کر دیا تھا جو اس جیسا ہی بدکردار لڑکا تھا۔ان پر امن زندگیوں میں جو خود کو بدقسمتی سے محفوظ خیال کرتی ہیں، ایسی

باتیں بتائی جاتی ہیں۔ وہ باہر سے آتی ہیں، باہر رہتی ہیں اور خوف زدہ کرتی ہیں۔ مگر تعریف ہو خدا کی ہمارے گھر ایسی باتوں سے محفوظ ہیں۔ طاؤس۔ ہاں وہ عزت واحترام کے باوجود یوں پکارے جانے کو پسند کرتی تھی اور جو اس کی ہمہ دانی کے حسب حال تھا۔ وہ اپنے جاسوسوں کے حلقے کی بدولت قرب وجوار کی ہر بات سے آگاہ تھی۔ مگر وہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ جانتی تھی۔ مشہور تھا کہ وہ بیماریوں کا علاج کرسکتی ہے اور خطا کار شوہروں کو گھر لاسکتی ہے۔ اس میں اعتقاد رکھنے والی بہت سی عورتیں علاج معالجے، تعویذ گنڈے اور ٹونے ٹوٹکے کے لیے اس کے پاس آجایا کرتی تھیں۔ اور جن کو اعتقاد نہیں تھا وہ یوں ظاہر کرتیں گویا مسائل سے بچنے کے لیے وہ بھی اعتقاد رکھتی ہیں۔ طاؤس اپنی قوتوں اور کبھی کبھاران سے پیدا ہونے والے خوف و ہراس سے لطف اندوز ہوا کرتی تھی۔ عائشہ خوب جانتی تھی کہ اس کی ہاں میں ہاں ملانا نہ ملانے سی کہیں زیادہ بہتر ہے۔ اس کا طرزِ عمل بھی اس تصور کے موافق تھا۔ عائشہ نے البتہ اس کی پیروی کرنے سے گریز کیا۔ وہ اس عورت کو ناقابل برداشت سمجھتی اور کبھی کبھی اس سے نفرت بھی کرنے لگتی خاص طور پر جب اس کی بڑی اور خطرناک باتوں کے ساتھ ساتھ اس کا رویہ زیادہ تحکمانہ ہو جاتا یا وہ کھا جانے والی نظروں سے دیکھتی۔ طاؤس ہی سے عائشہ نے درخواست کی تھی کہ وہ اپنی ماورائی قوتوں کے بل بوتے پر فائزہ کا رنگ روپ اور رحمت واپس دلائے اور ہونے والے بچے کو خوبصورت بنا دے۔ طاؤس نے اسے ایسا گھناؤنا مشروب تیار کر کے دیا کہ فائزہ نے اسے گندے پانی میں پھینک دیا۔ عائشہ نے عافیت اس میں دیکھی کہ وہ اس واقعہ کو نظر انداز کر دے وگرنہ بات نکلتی نکلتی طاؤس کے کانوں تک بھی پہنچ سکتی تھی۔ اصل میں بچپن کی جان پہچان کے باوجود عائشہ کو بھی اس سے ڈر آتا تھا۔ پھر بھی طاؤس کو تھوڑا بہت اندازہ ہو ہی گیا تھا۔

"تمہیں یقین ہے کہ تمہاری بہو نے دوا کی وہ خوراک پی لی تھی؟ مجھے تو شک ہے۔ اس نے پی ہوتی تو اس کا رنگ روپ نکھر آیا ہوتا۔ دوا بڑی زبردست تھی۔ بی بی تمہاری بہو بڑی شے لگتی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم اس پر نظر رکھو۔"

طاؤس خوب جانتی تھی کہ فائزہ اکثر محفل سے اٹھ کر چلی جاتی ہے اور سہ پہر کی ان محفلوں میں کبھی دلجمعی سے حصہ نہیں لیتی۔ وہ یہاں تک محسوس کرتی تھی کہ فائزہ اس سے

کنی کتراتی ہے۔ یہ بات اس نے عائشہ کو بتائی۔ ظاہر ہے کہ عائشہ اس کے علاوہ اور کچھ نہ کرسکتی تھی کہ وہ فائزہ کو زیادہ مؤدب ہونے کے لیے کہے۔

جب فائزہ نے ثمینہ کو گھریلو زندگی کی اکتا دینے والی یکسانیت میں سہ پہر کی ان محفلوں سے لطف اندوز ہوتے دیکھا تو اسے یاد آیا کہ وہ بھی کافی کے ان لمحات میں اپنی ماں کی سہیلیوں کی شرکت سے کس قدر لطف اٹھایا کرتی تھی جہاں نسوانی دوستی، محبت اور شادمانیوں کے کھلے طور پر اظہار ہوتا تھا۔ جہاں مرد کی بوجھل اور آمرانہ دنیا سے نجات کے چند لمحے حاصل ہوتے تھے۔ ان محفلوں نے اس کی آئندہ تمام زندگی کی بشارت نہ دے دی تھی۔ ساس کی سہیلیوں کے برخلاف ماں کے دوستوں کی محفلیں اسے عورتوں کی نیم راہبانہ زندگی پر غور کرنے کے لیے اس قدر شدت اور مایوسی کے ساتھ مجبور نہ کرتی تھیں۔ وہ سرگرم زندگی کے لیے راہ کی متلاشی تھی۔ ایسی زندگی جو ماضی کے بجائے آج کی جدید زندگی کا حصہ ہو۔ ان عورتوں میں اسے اپنے دس سال بعد۔ بیس سال بعد۔ تیس سال بعد کے مستقبل کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ اگر زندگی اس کی ساس اور شوہر کی بنائی ہوئی ڈگر پر چلتی رہی۔ پوری قوت کے ساتھ وہ اس مستقبل کو مسترد کرتی تھی۔ کئی بار وہ ان محفلوں سے اٹھ کر چلی گئی۔ اس لیے نہیں کہ اسے عورتیں اچھی نہ لگتی تھیں، بلکہ اس لیے کہ اس کے خیالات، احساسات اور انکار اس میں کراہت پیدا کر دیتے تھے۔ اس کا حلق خشک ہو جاتا۔ یہاں تک کہ وہ کسی شے کو اس جبر کو، سرگرانی کو اور ان آنسوؤں کو بھی پی نہ سکتی جو کبھی کبھی ہر شے کو ڈبو دیا کرتے ہیں۔

عائشہ کی ایسی ہی ایک تقریب کے بعد رات کو فائزہ نے بدنی تقاضے کو شدت سے محسوس کیا اور اسے ایسا تجربہ ہوا جو ہارون اسے فراہم کرنے کا فن نہ جانتا تھا۔ یا شاید اس قابل ہی نہ تھا۔ اپنے جسم پر ملائمت سے ہاتھ پھیرتے پھیرتے وہ نیند کی وادی میں کھو گئی۔ صبح وہ تازہ دم اور پرسکون تھی۔ جونہی اسے اپنی یہ دریافت یاد آئی اس نے سوچا کہ یہ ضرور ممنوع ہوگی کیونکہ کبھی کسی نے اس کے متعلق بات ہی نہیں کی تھی۔ دن بھر وہ اس نئے اور نامعلوم تجربے کو خیالوں کی دنیا میں، حماموں میں عورتوں کی چھیڑ چھاڑ، قہقہوں اور نگاہوں سے گڈمڈ کرتی رہی۔ پھر اسے ہارون کا خیال آیا۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ لیکن اس کے جسم سے بے رحمی کے ساتھ کھیل کر اس نے بے پناہ جسمانی مسرت حاصل کی تھی۔

یہ بات مناسب نہیں۔ اگر مرد کو لطف اندوز ہونے کا حق ہے تو پھر عورت کو بھی یہی حق حاصل ہونا چاہیے۔ ہاں اگر ایسا ہو تو سب کچھ بدل جائے۔ وہ اپنے اوپر مسلط کیے جانے والے عورت اور مرد کے تعلق سے مختلف نوعیت کے تعلق کی خواہاں تھی۔ اسے اور قسم کی محبتوں کی خواہش تھی۔ موجودہ زندگی کو رد کرنے کے ساتھ ساتھ اب نئی خواہشیں، نئی امنگیں اور نئے تقاضے بھی پیدا ہو گئے تھے۔

عائشہ اور احمد دونوں خوشی اور توجہ کے ساتھ جمال سے ہارون کا خط سن رہے تھے۔ اسے پڑھنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔

''خیر، یہ لمبا نہیں ہے، لگتا ہے کہ کسی بندر نے لکھا ہے۔''

یہ جملہ عائشہ کو اچھا نہ لگا۔ علی نے جمال کی طرف دیکھتے ہوئے ناک اوپر کو اٹھایا۔ ''غلط ہے۔ غلط ہے، بندر تو لکھ ہی نہیں سکتے۔''

''اچھا تو پھر تم بھی بندر ہو۔ تمہیں بھی تو لکھنا نہیں آتا۔''

ننھے علی کی بات سے محظوظ ہو کر احمد نے ہمیشہ کی طرح اسے گلے لگا لیا۔

''اچھے بچوں کی طرح خاموشی سے سنو بیٹا۔ یہ تمہارے بڑے بھائی کا خط ہے۔''

علی کھلونے سے کھیل رہا تھا اور اسے مضبوطی سے پکڑے ہوئے بھی تھا تاکہ نفیسہ، چھین نہ لے۔

ثمینہ فائزہ کو بلانے لگی۔

''فائزہ، فائزہ۔ آؤ ہارون کا خط آیا ہے۔''

جمال پڑھ رہا تھا۔

''سردی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ پھر بھی میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ سب کو پیار اور آداب۔ میں تم سب کے متعلق سوچتا رہتا ہوں۔ اپنا اپنا خیال رکھا کرو۔''

فائزہ اندر داخل ہوئی تو صرف آخری جملے سن سکی تھی۔ عائشہ نے خط لے کر اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

''تمہارا شوہر بخیریت ہے۔'' احمد نے نرمی سے فائزہ کو بتایا ''اسے امید ہے کہ تم بھی بخیریت ہو۔ وہ خوش خبری کا منتظر ہے۔''

''شکریہ۔''

فائزہ نے اپنے سسر، عائشہ اور پھر جمال کو دیکھا اور لوٹ آئی۔ ''اس کے شوہر کا خط آیا ہے۔ خوش خبری کا ذکر بھی ہے اور اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا؟ آخر مسئلہ کیا ہے؟ مجھے تو اس کی کبھی سمجھ نہیں آئے گی۔''

''مسئلہ۔ مسئلہ یہ ہے کہ اپنے شوہر کا خط اسے خود پڑھنا پسند ہوگا۔ چاہتی ہوگی کہ وہ اسے براہ راست لکھے۔ وہ پڑھنا جانتی ہے۔ اس کی بیوی ہے۔'' احمد اب چڑ گیا تھا۔ اس نے جمال کی طرف دیکھا۔

''جمال دیکھو۔''

جمال کمرے سے نکل آیا۔ ثمینہ بھی اس کے پیچھے پیچھے باہر آ گئی اور عائشہ کے شکوے پھر سے شروع ہو گئے۔

''اس گھر کو کیا ہو رہا ہے؟ بات کیا ہے؟''

علی اندر آ کر ٹی وی دیکھنے کی غرض سے باپ کی گود میں بیٹھ گیا۔

''ابا، کیا واقعی بندر لکھ سکتے ہیں؟''

''تمہارے جیسے بندر تو واقعی لکھ سکتے ہیں۔''

''میں بندر نہیں ہوں۔''

احمد نے دوبارہ بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔

''لکھے؟ - کیوں لکھے؟ بچے اب تمہاری عزت نہیں کرتے۔ ہاں اسے یہ غلط فہمی بھی دور کر دینی چاہیے کہ مجھے معلوم نہیں کہ وہ ثمینہ کو کپڑے سینے کی بجائے لکھنا پڑھنا سکھا رہی ہے۔ اب یہ کھیل نہیں چلے گا۔ میں انہیں جدا کر دوں گی۔ بیٹی کو اس کے برے اثرات سے بچانا ضروری ہے۔''

''رائی کا پہاڑ نہ بناؤ۔ یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ آج کل پڑھائی اچھی چیز ہی ہے۔ پھر جب بچہ پیدا ہوگا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''تمہارے لیے تو سب کچھ ہی اچھا ہے۔ پہلے توجہ نہیں کرتے۔ جب کچھ ہو جائے تو آنکھیں نکالتے ہو۔ لیکن بعد میں کیا ہو سکتا ہے- ہائے تم مرد۔''

''عائشہ۔ اگر تم بات کا بتنگڑ بنانا بند کر دو تو سب کچھ بہتر ہو جائے۔''

''ہاں ہاں۔ کہو۔ سب میرا قصور ہے۔''

''میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ اپنے اپنے مزاج کا معاملہ ہے ویسے یہ کوئی بری بات بھی نہیں۔''

''خیر دیکھیں گے۔ ضرور دیکھیں گے۔ آؤ۔ کسے خبر تھی۔''

عائشہ نے باقی جملہ چبا لیا اور احمد سگریٹ پیتے ہوئے ادھ کھلی آنکھوں سے ٹی وی دیکھنے لگا۔ بچہ اس کی گود میں ابھی ابھی سو گیا تھا۔ ثمینہ نے سوئی ہوئی نفیسہ کو بستر پر لٹا دیا اور کسی نئے جھگڑے سے دامن بچانے کی خاطر اپنے کمرے ہی میں بیٹھ گئی۔

اس رات فائزہ بیمار ہو گئی۔ چونک کر وہ اٹھی۔ اس کے پیٹ میں درد تھا اور سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ کراہنے لگی۔ عائشہ جو ابھی تک جاگ رہی تھی، بھاگی آئی۔ ''کیا بات ہے بیٹی؟ فکر نہ کرو۔ کوئی بات نہیں۔''

وہ نزدیک آئی اور فائزہ کا اترا ہوا زرد چہرہ اور سراسیمہ نگاہیں دیکھیں ''کوئی فکر کی بات نہیں۔ میری بیٹی! خدا ہماری حفاظت کرے۔ بدروحوں سے محفوظ رکھے۔''

یہی دعائیں مانگتی ہوئی وہ فائزہ کے پلنگ کے گرد چلتی رہی۔ فائزہ کی سسکیاں جاری تھیں۔ عائشہ اچانک رک گئی۔ اسی لمحے احمد کمرے میں داخل ہوا۔

''میرے ماں باپ کو بلاؤ۔ میں درد سے مری جا رہی ہوں۔ میں ماں باپ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''کل ہم ڈاکٹر کو بلا لیں گے اور تمہارے والدین کو بھی آنے کے لیے کہیں گے۔'' احمد نے کہا۔

عائشہ اس بات پر چڑ گئی کہ اسے فائزہ کی دیکھ بھال کے لیے تنہا نہیں رہنے دیا گیا۔ وہ فائزہ کی کیفیت اور خود اپنی پریشانی کو کم کرنا چاہتی تھی۔

''فکر کی کوئی بات نہیں۔ اس جیسی حالت میں ایسی باتیں تو ہوتی ہی ہیں۔ میں ابھی جوشاندہ تیار کرتی ہوں۔ تم بالکل فکر نہ کرو۔''

درد سے کراہتے ہوئے فائزہ کروٹیں بدلنے لگی۔ درد اور اندیشوں سے اس کی جان پر بن آئی تھی۔ چھاتی پر اسے بوجھ محسوس ہوتا تھا جو سانس نہ لینے دیتا تھا۔ عائشہ خاموشی کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔ احمد فائزہ کے پاس کھڑا تھا جو اب اونگھنے لگی تھی۔ وہ

چپکے سے باہر نکلا تا کہ ثمینہ کو جگا کر بھابھی کے پاس رہنے کو کہے۔

''اس کا خیال رکھو اور کوئی غلط بات ہو تو فوراً ہمیں جگا دینا۔''

ثمیہ نے جلدی سے ایک چغا پہنا۔ جب وہ فائزہ کے پاس گئی تو وہ سو چکی تھی۔ عائشہ جوشاندہ لیے کمرے میں داخل ہوئی۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''ابا نے مجھے فائزہ کے پاس رہنے کو کہا ہے۔''

''وہ تو سو بھی چکی۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ایسی حالت میں اس قسم کی باتیں ہوتی ہی ہیں۔ لیکن ابا نے کہا ہے تو یہیں رہو۔ وہ جاگے تو گرم کر کے جوشاندہ اسے پلا دو۔ یوں اسے آرام ملے گا۔ کل ہم دایہ کو بلا لیں گے۔ ہم عورتوں کے ساتھ ہر وقت کوئی نہ کوئی مصیبت ہوتی ہی ہے۔''

پریشانی کے عالم میں وہ کمرے سے نکل گئی۔ ثمینہ نے اپنی بھابھی، اپنی غمگسار کو سوتے ہوئے دیکھا۔ اس کے چہرے سے درد کے آثار نمایاں تھے۔ لگتا تھا جیسے اس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔ ثمینہ نے اس کے بالوں کو چوما، ماتھے سے پسینہ صاف کیا۔ پھر اسے چوما اور یہ دیکھ کر کہ وہ ابھی تک سوئی ہوئی ہے، ثمینہ اس کے ساتھ لیٹ گئی۔ نیند ابھی اس کی آنکھوں سے دور تھی۔ اندیشوں نے اس کے تخیل میں ہلچل مچا دی تھی۔ خیالوں میں وہ فائزہ کو شدید بیمار دیکھنے لگی۔ ہارون فرانس سے واپس آ کر رو رہا تھا۔ بالآخر ثمینہ سو گئی۔

دوسرے روز دیر سے فائزہ کو اسی وقت اٹھایا گیا جب اس کے والدین آ چکے تھے۔ وہ اس کے قریب کھڑے تھے، اپنے بازوؤں میں اٹھا رہے تھے اور پیار کر رہے تھے۔

درد ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔

''میں اب یہاں بالکل نہیں رہنا چاہتی۔ مجھے لے جاؤ۔''

''میری جان۔ عقل کی بات کرو۔ تم شادی شدہ ہو۔ تمہارے بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ یہی تمہارا گھر ہے۔ تم بیمار ہو۔ فکر نہ کرو میری جان۔ تمہاری حالت میں اس قسم کی باتیں ہوتی ہی ہیں۔ ڈاکٹر آنے ہی والا ہے۔''

''میرا یہاں دم گھٹ رہا ہے۔ دم گھٹ رہا ہے۔''

لگتا تھا کہ واقعی اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ بار بار اپنا ہاتھ گلے تک لاتی۔ حالت بدتر ہوئی جا رہی تھی۔ اس نے ماں باپ سے امیدیں لگا رکھی تھیں لیکن وہ بھی کچھ کرنے پر تیار نہ تھے۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔

فائزہ کو ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔

جانے سے پہلے قدیر نے احمد کو اعتماد میں لیتے ہوئے کہا:

''لگتا ہے وہ خوش نہیں۔ شوہر باہر جا چکا ہے اور وہ جوان ہے۔ ہمیں بڑی پریشانی ہے۔''

''میرا خیال تھا کہ ہارون یہیں رہے گا۔ اسے یہاں رکھنے کے لیے میں نے سب کچھ کیا ہے۔ لیکن اسے یہاں کوئی کام ہی نہیں ملا۔ میں اس کی مدد پر تیار تھا لیکن اس کے لیے یہ بات آسان نہ تھی۔ کچھ عرصے کے لیے اس نے باہر جانا ہی مناسب سمجھا۔''

'یہ اچھی بات نہیں ہے۔ مجھے خبر نہ تھی کہ حالات ایسے ہو جائیں گے۔ ہمیں بڑی پریشانی ہے۔ وہ اس قدر بدل گئی ہے۔ آج کی جوان عورتیں مختلف ہیں۔ وہ ہماری بیویوں جیسی نہیں۔ سکول بھی تو جانے لگی ہیں۔ واقعی یہ مشکل ہے۔ میں جانتا ہوں۔''

حیران وہ پریشان اور خیالوں میں گم وہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

ہسپتال کی سیڑھیوں میں وہ ایک جوان لڑکی کے پاس سے گزرے جس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ تین مرد غصے کے عالم میں اسے دھکے دے رہے تھے اور برا بھلا کہہ رہے تھے۔

فائزہ نے توجہ سے اسے دیکھا۔ وہ بہت تھکی ہوئی تھی اور مشکل کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ پیٹ میں درد ابھی تک ختم نہ ہوا تھا۔ ایک نرس نے انہیں لوگوں سے بھری ہوئی انتظار گاہ میں بیٹھنے کو کہا۔ حمیرہ صرف اپنی بیٹی کو، اس کی زردی کو، درد اور پریشانی کی علامتوں کو دیکھ رہی تھی۔ قدیر کی نظریں فرش پر جمی تھیں اور وہ دعائیں مانگنے لگا تھا۔ فائزہ کا سانس قدرے آسان ہو گیا تھا۔ اسے خوشی تھی کہ وہ بالآخر اپنے سسرال سے باہر نکل آئی ہے۔

طویل مشاورت، جو فائزہ کے لیے بہت تکلیف دہ تھی، کے بعد ڈاکٹر نے کہا:

''اسے ہسپتال میں داخل کرنا ہوگا۔ بہت سے ٹیسٹ بھی ہوں گے۔ ابھی میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''بچہ شاید ضائع ہوسکتا ہے۔'' جاتے ہوئے ڈاکٹر نرس سے کہنے لگا۔

اس نے یہ بات دھیمی آواز میں کہی تھی۔ مگر اس قدر دھیمی نہیں کہ دوسرے سن نہ سکتے۔ حمیرہ پریشانی سے فائزہ کو دیکھنے لگی۔ فائزہ نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔ وہ تو لمبے لمبے برآمدوں، کمروں، داخلے کی پابندیاں، گھومنے والی چارپائیوں، کراہنے والے بیماروں اور ایمرجنسی میں آنے والے زخمیوں کی اس نئی دنیا کی دریافت سے حیران ہو رہی تھی۔ وہ بوتلوں، پچکاریوں اور دواؤں کی اس نئی دنیا کو دریافت کر رہی تھی۔ وہ دنیا جس کی تہہ میں بیماری اور تشویش ہے۔ اس کی گرفت میں فائزہ دوبارہ تکلیف محسوس کرنے لگی۔

ماں کے بعد سب سے پہلے اسے مریم ملنے آئی جسے حمیرہ نے اطلاع بجھوا دی تھی۔ وہ پھول، مٹھائی اور ایک بین الاقوامی فیشن میگزین ہمراہ لائی تھی۔

''یہ بڑی شے ہے۔ ذرا انتظار کرو۔''

''شش! یہ ساتھ والی عورت کا پرسوں ہی آپریشن ہوا ہے۔''

''کیوں، کیا ہوا ہے اسے؟''

''پتہ نہیں۔''

''اور تمہیں۔ تمہیں کیا ہوا ہے؟''

''پتہ نہیں۔ پیٹ میں شدید درد ہے۔ تکلیف بہت ہے۔ آج ہی انہوں نے ٹیسٹ شروع کیے ہیں۔''

''فکر نہ کرو۔ انہیں کوئی خرابی نہ ملے گی۔ تمہارے شوہر کو معلوم ہے؟''

''ارے نہیں۔ شاید وہ اسے بتائیں گے بھی نہیں۔ خیر اچھا ہی ہے۔ اس سے کیا فرق پڑنا تھا؟ تمہیں پتہ ہی ہے کہ مجھے اس کو خط لکھنے کی اجازت نہیں۔ میرے پاس اس کا پتہ بھی نہیں اور وہ صرف اپنے والدین کو خط لکھتا ہے۔ جیسے میرا کوئی وجود ہی نہ ہو۔''

مریم نے اس کے پیٹ کو چھوا اور مسکرانے لگی۔

''ابھی اس کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔''

فائزہ ہنس دی۔ وہ رسالے کے صفحے پلٹنے لگی تھی۔

''دیکھو۔ یورپ والے ہمارے روایتی سٹائلوں کی نقل کرتے ہیں۔ یہ بے حد خوبصورت ہے۔کیا ایسے لباسوں میں ہمیں تم تصور کرسکتی ہو۔''

ساتھ والی مریضہ کو فراموش کر کے وہ ہنسنے لگیں۔ پھر جونہی اس کا خیال آیا وہ دوبارہ آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگیں۔

''یہ بڑا خوبصورت رومانی ناول ہے۔خواب جیسی کہانی ہے۔''

''ارے تمہیں زیادہ خواب نہیں دیکھنے چاہئیں۔ میں خود بھی زندہ رہنا چاہتی ہوں۔زندگی کو خوابوں کی نذر نہیں کرنا چاہتی۔''

لمحہ بھر کے لیے اسے اپنی ہی بات پر تعجب ہوا۔ وجدانی طور پر اسے احساس تھا کہ اس بات کے معنی اس سے زیادہ ہیں جتنا کہ وہ سمجھتی ہے۔تاہم مریم بولتی چلی گئی: ''یہ ناول ایک فلسطینی نرس نے لکھا ہے۔ اسے پڑھنا آسان نہیں مگر تمہیں پڑھنا ضرور چاہیے۔''

مریم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فائزہ نے کتابیں گدے کے نیچے چھپالیں۔

''تم انہیں چھپارہی ہو؟''

''بہتر یہی ہے۔تم میری ساس کو نہیں جانتیں۔ اور میں کوئی جھگڑا نہیں چاہتی۔''

''اگر وہ میری ماں جیسی ہے تو بہتر ہے کہ انہیں پڑھنا نہیں آتا۔تبدیلی پر تو وہ کسی طور آمادہ نہیں۔''

انہیں دوبارہ مل کر خوشی ہوئی تھی۔انہوں نے مٹھائی کھائی،ہنسی کھیلیں اور نئے کھلنے والے ٹیولپ کے پھولوں کی تعریف کی۔

''میں اسے پورا پڑھوں گی۔ بہت شکریہ۔ ویسے ہے یہ بات ناقابل یقین۔ اور میں تو کہنے کا حوصلہ بھی نہیں پاتی۔ ہاں تم سے۔ میں تمہیں بتاؤں؟ بیمار ہونے کی تو نہیں البتہ یہاں پہنچ جانے کی بہت خوشی ہے۔ اپنے سسرال سے باہر میں کسی جگہ بھی رہ سکتی ہوں۔مریم آخر میرا کیا بنے گا؟ میرا نہیں خیال کہ میں حالات سے سمجھوتہ کرسکوں گی۔''

مریم نے اپنی دوست کی طرف دیکھا جو پہلے سے کہیں زیادہ دبلی پتلی اور مختلف

دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔ وہ پریشان تھی لیکن اپنے احساسات ظاہر نہ کرتی تھی۔

''جانے بھی دو۔ ایسی باتیں سوچ کر اپنے آپ کو رنجیدہ نہ کرو۔ اب تم تھک چکی ہو۔ اپنا خیال رکھو۔ اہم ترین بات یہی ہے۔ اس کے بعد۔''

ساتھ والے بستر کی مریضہ نے کراہتے ہوئے کروٹ لی۔ مریم اور فائزہ اسے دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔ مریم نے سوچا کہ کسی ایسے انسان کے قریب ہونا بھی کتنا کرب ناک ہے جو تکلیف میں ہو اور کراہ رہا ہو۔ اس نے چاہا کہ فائزہ اسے دل کی بات بتا دے۔ وہ جانتی تھی کہ شرافت کی بنا پر فائزہ اس سے بہت کچھ چھپا رہی ہے۔ اسے افسوس ہوا کہ مصنوعی رکاوٹوں نے اسے دل کا بوجھ ہلکا کرنے سے روک رکھا ہے۔ اسے اس بات کا بھی افسوس تھا کہ وہ زندگی کو بدلنے میں فائزہ کی مدد نہیں کر سکی۔ اس بے بسی پر اسے غصہ بھی آیا۔

جب وہ جدا ہونے لگیں تو فائزہ نے مریم کو جاتے ہوئے دیکھا اور محبت کا طوفان اس کے دل میں امڈ آیا۔ وہ اس کی ملائمت، نزاکت، حساسیت، اس کی خوشی اور زندہ دلی کو پسند کرتی تھی۔ ان صفات کی بنا پر وہ زندگی سے خوب لطف اٹھاتی تھی اور بسا اوقات لالچی، متجسس اور حاسد بھی بن جاتی تھی۔ فائزہ کو اس وقت وہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ یوں اسے مریم پر رشک آیا۔ اس نے ان باتوں کا جائزہ لیا جنہوں نے ان دونوں کی زندگیوں کو مختلف بنا دیا تھا اور جو ان کے درمیان خاموشی میں اضافہ بھی کر دیں گی۔

فائزہ تھکی ہوئی تھی۔ اس لیے چند منٹوں کے لیے اسے اونگھ آ گئی۔ جب وہ جاگی تو عائشہ اس کے بستر پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ''تم نے تو ہمیں ڈرا ہی دیا بیٹی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ بچہ ٹھیک ٹھاک ہے اور تم بھی پہلے سے بہتر لگتی ہو۔ میرے خیال میں اب تم کھا پی رہی ہو؟ اچھی طرح کھانا بیٹی۔ آخر تم نے اسے دودھ بھی تو دینا ہے۔''

فائزہ، عائشہ پر مسکرا دی۔ اسے خوب معلوم تھا کہ اس مہربانی کا رخ اس کے بجائے مستقبل کی ماں کی طرف تھا۔ لیکن اس نے اس بات کو نظر انداز کر دیا۔ وہ ساس کی

پیش بندیوں کو اچھی طرح سمجھتی تھی جو اس کی توقعات سے بھی بڑھ کر تھیں۔ اگر وہ ساس کو بتا دے کہ جب اس نے بچے کے مردہ ہونے کے خدشات کی بابت سنا تو بالکل پروا نہ کی تھی، تو اس کی ساس اسے یوں دیکھے گی جیسے وہ چڑیل ہو۔ کیا واقعی وہ چڑیل ہے؟ آخر ایسا کیوں ہے کہ کبھی تو اسے اپنے بطن میں پلنے والی زندگی کا بھرپور احساس ہوتا ہے اور کبھی وہ بے نیاز ہو جاتی ہے۔ تعجب اور پریشانی کے ساتھ اس نے محسوس کیا کہ انسان متضاد تاثرات اور جذبات کا کس قدر زیادہ شکار ہو سکتا ہے۔

''یہ پھول کون لایا تھا؟''

''میری سہیلی مریم۔ وہ تمہارے آنے سے ذرا پہلے واپس گئی تھی۔''

عائشہ کو مریم اور اسے فائزہ سے دور رکھنے کی اپنی خواہش اچھی طرح یاد تھی۔ لیکن اس نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ بھول چکی ہو۔

''مریم؟ وہ محی الدین اور واجدہ کی بیٹی جو ہمارے گھر بھی آئی تھی؟''

''ہاں''

''وہ تمہاری عمر کی ہے۔ نہیں؟ اس کی شادی بھی جلد ہونے والی ہے؟''

''ابھی وہ سکول جاتی ہے۔''

''سکول۔ بھلا عورت کا اس سے کیا کام۔''

فائزہ مسکرانے لگی۔ گھر سے باہر آنے کے بعد وہ عائشہ کی اپنے ذاتی عقائد کی مسلسل اور ان تھک توثیق سے وہ محظوظ ہونے لگی تھی۔

''لگتا ہے کہ ٹیسٹ ختم ہونے کے بعد تم جلد ہی گھر واپس جانے کے قابل ہو جاؤ گی۔ ڈاکٹر یہی کہتا ہے۔ میرے خیال میں تمہیں کچھ نہیں ہوا تھا۔ لیکن آج کل ان کم بخت ٹیسٹوں کا رواج ہی ہو گیا ہے۔ خیر میں تمہارے لیے کچھ سنگترے لائی ہوں۔ تمہارے لیے یہ اچھے ہیں۔ اور یہ کچھ بسکٹ بھی ہیں۔''

فائزہ نے عائشہ کا شکریہ ادا کیا۔ وہ اپنی بہو کا بیمار روپ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ ساتھ کے بیڈ والی مریضہ عائشہ کا غور سے جائزہ لے رہی تھی۔ جونہی عائشہ باہر نکلی تو وہ کہنے لگی:

''پیاری، کیا وہ تمہاری ماں ہے؟''

''نہیں، ساس۔''

''وہ اچھی عورت دکھائی دیتی ہے۔آہ! ہمارے زمانے میں تو ہماری اس طرح پروانہیں کی جاتی تھی۔ میرے آٹھ بچے ہوئے۔ تین پیدا ہوتے ہی مر گئے اور ایک جنگ کی نذر ہو گیا۔ پندرہ سال کی عمر میں میری شادی ہوگئی تھی لیکن کبھی کوئی گلہ نہیں ہوا۔ وہ بہت اچھا آدمی تھا۔ کیا یہ تمہارا پہلا بچہ ہے؟''

فائزہ نے سر ہلایا۔

''دیکھ لینا بیٹا ہوگا۔ بیٹیوں کی ضرورت بھی ہوتی ہے لیکن پہلے بیٹا ہونے کی خواہش ہمیشہ ہوتی ہے۔ ہاں دیکھ لینا بہت خوبصورت بیٹا ہوگا۔''

وہ پھر اونگھنے لگی۔ آپریشن نے اسے بہت نڈھال کر دیا تھا۔ جونہی اس کی آنکھ لگتی تمام دکھ درد بھول جاتی۔

لڑکا؟ لڑکی؟ کیا فرق پڑتا ہے؟ اس نے ہونے والے بچے کے متعلق سوچنا بند کر دیا۔ اس کے ذہن میں پھر شادی۔ پہلا بچہ۔ دوسرا بچہ۔ اور سسرال میں رہنے کے متعلق خیالات اور اندیشے گھومنے لگے۔ ہاں اس بات کے امکانات بہت زیادہ تھے کہ اس کا مستقبل اس کی امنگوں، خواہشوں اور آرزوؤں کے مطابق نہ ڈھل سکے گا۔ جوں جوں وہ ان باتوں کے متعلق سوچ رہی تھی اس کا سانس اکھڑتا جا رہا تھا اور سینے کا بوجھ بڑھ رہا تھا۔ اس لیے اب اس نے کھڑکی کے باہر اگے ہوئے پام کے درخت کو دیکھنا شروع کر دیا۔ پھر بھی اس کے خیالات بار بار الجھ جاتے۔ شاید اسے کتاب پڑھنی چاہیے یا فیشن میگزین جس میں کام کی بہت سی باتیں ہوتی ہیں۔

فائزہ کے قیام میں توسیع کر دی گئی۔ ڈاکٹروں کو اب بھی بچے کے ضائع ہونے کا خدشہ تھا، اس لیے بعض ٹیسٹ جاری رہنے تھے۔ بیماری نے اسے اپنے گھر والوں اور دوستوں سے ملنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ عائشہ بھی بالکل مختلف روپ میں نمایاں ہوئی تھی۔ فائزہ اس بات پر حیران تو ہوئی لیکن وہ یہ ماننے پر تیار نہ تھی کہ آئندہ بھی عائشہ کا رویہ ایسا ہی خوش گوار رہے گا۔ حالات بدل گئے ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے۔

یہاں اس کے سب سے گہرے تجربات، نئے تعلقات اور ایک ایسی نئی دنیا کی دریافت تھے جس سے وہ بالکل بے خبر تھی۔ ہسپتال جس سے بیک وقت ڈر بھی لگتا تھا اور کشش بھی محسوس ہوتی تھی۔ اس نے اچانک ایک نئی دنیا کے تمام دروازے کھول دیے

تھے۔ یہ نئی دنیا نئے چہروں اور نئے تجربوں سے بھرپور تھی۔ ہسپتال سینکڑوں ناولوں کا موضوع بن سکتا تھا جو کبھی لکھے نہ جائیں گے۔ بس سرگوشیوں میں مدتوں تک بیان ہوں گے۔ یہ ایسی مایوسیوں، پچھتاووں اور آشاؤں کا مقام تھا جن کے اظہار کی جسارت کی ضرورت تھی۔ ہسپتال وہ خوف بھی تھا جو ان ڈاکٹروں نے اس کے دل میں پیدا کر دیا تھا جو یہاں گھر میں والدین کی طرح مطلق العنان تھے۔ وہ اپنے علم اور اختیارات کے لیے احترام کی ترغیب دیتے تھے اور اس کی توقع بھی کرتے تھے۔ یہاں قیام کے دوران اسے اپنی مسلسل محتاجی کی صورت حال کو سمجھنے میں مدد ملی۔ گھر میں بھی دوسروں پر بھروسہ۔ یہاں بھی دوسروں پر آسرا۔ وہاں بھی پابندیاں۔ یہاں بھی پابندیاں۔ اطاعت، ہر جگہ اطاعت۔ وہ تو بس مجسم اطاعت ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ بات صرف دوسرے ہی جانتے تھے کہ اس کے لیے بہتر کیا ہے۔ ''بیٹی یہ تمہاری بہتری کے لیے ہی ہے۔'' وہ اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ کوئی نہیں پوچھتا تھا کہ اس کی اپنی رائے کیا ہے۔ دوسرے جو جانتے تھے۔ جوں جوں وہ اپنی بے خبری کا جائزہ لیتی گئی، اس سے نفرت بھی بڑھتی گئی۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا کہ وہ نرس بننے کے قابل ہو سکتی ہے؟ کیا وہ روزانہ بیماروں کی خدمت کر سکتی ہے؟ دکھ اور موت کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتی ہے؟ کبھی اسے یہ خیال نہ آیا کہ وہ ڈاکٹر بھی بن سکتی ہے۔ وارڈ میں صرف ایک نوجوان خاتون ڈاکٹر تھی اور وہ بھی ڈاکٹر کی بیٹی تھی۔ اس نے کبھی یہ بھی نہ سوچا کہ اگر اسے درزن بننے کی خواہش تھی تو صرف اس لیے کہ وہ اس کام کے بارے میں کچھ جانتی تھی۔ جب کہ ان دوسرے پیشوں کے متعلق اسے کچھ معلوم نہ تھا جن کے دروازے اب عورتوں کے لیے کھل رہے تھے۔

یہاں اسے ان باتوں کی سمجھ آ گئی۔

یہاں آ کر اسے معلوم ہوا کہ اس کی پڑھائی، جو مکمل بھی نہ ہو سکی تھی، اس لیے اس کے گھر والوں کے لیے قابل قبول اور ممکن ہوئی کہ اس کے ٹیکنیکل سکول کی شہرت اچھی تھی۔ تعجب کے ساتھ اس نے دریافت کیا کہ جس بات کو وہ اپنی سب سے بڑی آزادی سمجھتی رہی تھی وہ ایسی بڑی آزادی ہرگز نہ تھی۔ ہسپتال میں قیام اس کے شعور کی آنکھیں کھلنے کا سبب بن گیا۔ جو کچھ اس پر بیتی تھی اور جو کچھ اس نے سیکھا تھا وہ سب کچھ خود کو سمجھنے کا وسیلہ بن گیا۔

MashalBooks.com

چار عورتیں گپ شپ کے لیے عموماً اس کے پاس آیا کرتی تھیں۔

لیلیٰ جو بائیس سال کی نوجوان استانی تھی۔ وہ ہنس مکھ اور خوش مزاج تھی اور اس کی مسکراہٹ میں کشش تھی۔ دوسروں کو ہنسانے کا فن جانتی تھی۔ حال ہی میں اس کا آپریشن ہوا تھا اور اب وہ بہتر محسوس کرنے لگی تھی۔ تھوڑے سے آرام کے بعد وہ پھر کام کاج کے لیے گھر واپس چلی جائے گی۔ اس کا کام سہل نہ تھا مگر اسے اس سے بے حد لگاؤ تھا۔

زہرہ نے حال ہی میں اپنی تیسویں سالگرہ منائی تھی۔ وہ ایک کیمیکل فیکٹری میں کام کرتی تھی اور انیمیا اور بلڈ پائزننگ کے شعبے میں ہسپتال میں داخل تھی۔ شاید یہ مرض اسے اپنے کام کی وجہ سے لاحق ہوئے تھے۔ اس کا شوہر اور دو بچے گھر میں اس کی واپسی کے بے چینی سے منتظر تھے اور وہ خود بھی جانے کے لیے بے تاب تھی۔ خاموش اور پریشان زہرا امید پرست لیلیٰ کی سنگت پسند کرتی اور ہر جگہ اس کے پیچھے جاتی تھی۔

فاطمہ کی عمر صرف سولہ سال تھی۔ وہ ہائی سکول کی طالبہ تھی اور حال ہی میں اس کا اپینڈے سائٹس کا آپریشن ہوا تھا۔ بخار کی وجہ سے ابھی وہ گھر واپس نہ جا سکی تھی۔ ٹرانسسٹر ریڈیو کان سے لگائے وہ ادھر ادھر گھومتی اور سوشل اور سیاسی خبروں پر اونچی آواز میں تبصرہ کیا کرتی۔ فائزہ اسے بہت پسند تھی۔ ایسی بے ساختہ پسند جسے بیان کرنا مشکل ہوتا ہے۔ پھر وہ دونوں تقریباً ہم عمر بھی تھیں اور فائزہ باتیں سننے کی اہلیت بھی خوب رکھتی تھی۔ فاطمہ اپنی پسند و ناپسند، خواہشوں، ناگواریوں، منصوبوں اور سوچوں کے علاوہ ہر نئی شے سے دل بستگی اور ہر پرانی بات سے بے زاری کا بلند آواز سے اظہار کرنے کی ضرورت محسوس کرتی تھی۔

چوتھی عورت نوراں پچاس برس کی عمر سے بھی زیادہ تھی۔ اس کا حال ہی میں گردے کا آپریشن ہوا تھا اور لیلیٰ نے چوری چھپے فائزہ کو بتایا تھا کہ شاید اسے کینسر ہے، لیکن وہ اس بات سے بے خبر ہے۔ اس کے چھ بچے تھے۔ شوہر ایک گیراج میں موٹریں دھوتا اور وہ خود گھروں کی صفائی کا کام کرتی تھی۔ نوراں ان چاروں عورتوں سے بہت خوش تھی جو اس سے بہت مختلف تھیں۔ اور جن کا رویہ دوستانہ اور کھلا تھا۔ پہلے وہ کبھی اس قدر آزادی سے باتیں نہیں کر سکی تھی۔ ہسپتال کا ماحول گھر اور کام کاج کے ماحول سے بالکل مختلف تھا۔ اس میں ان پانچوں عورتوں کے میل ملاپ سے بسا اوقات ایسی باتیں

شروع ہو جاتیں جو کسی اور جگہ کبھی نہ ہو سکتی تھیں۔ وہ اتنا بولتیں کہ تھک جاتیں۔ لیکن یہ تھکاوٹ ناگوار نہ گزرتی۔ ان عورتوں کے بغیر نوراں بالکل تنہا رہ جاتی۔ اس کے مہمان بہت کم آتے تھے۔ گھر والے گاؤں میں رہتے تھے اور شہر آنا ان کے لیے مشکل تھا۔

''مجھے تو تم جوان لوگوں کی بالکل سمجھ نہیں آتی۔ ہر وقت تم کام پر جانے کی باتیں کرتی رہتی ہو۔ لیکن میرے چھ بے ہیں اور مجھ سے پوچھو تو اس جھاڑ پونچھ کے کام کے بغیر کتنا مزہ آتا ہے۔''

''ہاں بھئی، لیکن گھروں کی صفائی کرنا تو کوئی کام نہیں۔'' فاطمہ نے اچھل کر نوراں کو جواب دیا۔

''اچھا جی۔ یہ بات ہے۔ ذرا کر و تو پتہ چلے یہ کام ہے یا نہیں''

''معاف کرنا۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ بے شک یہ بھی کام ہے اور ہے بھی تھکا دینے والا۔ لیکن جب عورتیں یہ کہتی ہیں کہ ہم کام کرنا چاہتی ہیں تو مطلب محض جھاڑ پونچھ نہیں ہوتا۔''

فاطمہ کو بات بنانے کی کوشش کرتے دیکھ کر سب ہنسنے لگیں۔

''تمہیں گھر کی صفائی کرنا پسند نہیں۔ لیکن گھروں کو صاف تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ آخر تم گندگی میں تو نہیں رہ سکتیں''

نوراں نے فائزہ سے پوچھا:

''تم نے سینے کا کام سیکھا۔ ٹھیک ہے ناں؟''

''ہاں۔ مگر میری شادی ہوگئی اور میں پورا نہیں سیکھ سکی۔''

''خیر، اپنی ضرورت کے مطابق تو تمہیں کام آ ہی گیا ہوگا۔ یہ بڑا مفید کام ہے۔ تمہیں کپڑے تیار کرنا تو آتے ہی ہوں گے؟ مجھے نئے فیشن کے نیلے کپڑے بہت پسند ہیں۔ شاید میں تھوڑے عرصے تک خریدنے کے قابل ہو جاؤں۔''

اپنی مخصوص بُو کے ساتھ فاطمہ واپس آئی۔ وہ اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے بے تاب تھی۔

''فائزہ تمہیں ایک نمبر درزی بنا دے گی۔ کیوں ٹھیک ہے فائزہ؟''

''ارے بھئی میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ ابھی مجھے مزید دو سال کام سیکھنا تھا۔ کام مکمل

کر کے اور ملازمت کر کے واقعی مجھے کتنی خوشی ہوتی۔''

''ملازمت حاصل کر کے۔ اور میرے پاس نہ ہوتی تو کتنی خوشی ہوتی۔''

''اچھا تو تم اپنے شوہر اور سسرال سے خوش ہو فائزہ؟''

یہ سوال زہرا نے پوچھا تھا۔

''میرا شوہر۔ وہ فرانس واپس جا چکا ہے۔ اسے میرا کام کرنا پسند نہیں۔ اصل میں اس کے والدین نے شادی کروائی ہے۔ ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اسے اپنی ماں جیسی بیوی چاہیے تھی۔''

لیلیٰ اور زہرہ زور سے ہنسنے لگیں۔ فاطمہ البتہ سنجیدہ رہی وہ پوری توجہ سے باتیں سن رہی تھی۔

''مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا'' زہرہ کہنے لگی ''تم مردوں کو جانتی ہی ہو۔ ماؤں نے ان کا ستیاناس کر دیا ہے۔ میں اپنے بیٹوں کے ساتھ یہ سلوک نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن یہ بڑی مشکل بات ہے۔ میرے پاس تین مرد ہیں اور وہ سب مجھے کنیز سمجھتے ہیں۔''

''زندگی یہی ہے۔'' نوراں نے زہرہ کو بتایا۔ نئی سہیلیوں کے ساتھ اب وہ زیادہ کھل کر باتیں کرنے لگی تھی۔

''تم چاروں اکٹھے رہتے ہو؟'' فائزہ نے سوال کیا۔

''ہاں''

''میرے خیال میں یہ بہتر ہے۔''

''رہی میں'' فاطمہ نے ہمیشہ کی طرح جوشیلے انداز میں کہنا شروع کیا: ''میں اپنا کام، اپنا شوہر خود منتخب کرنا چاہتی ہوں اور زندگی کے فیصلے بھی خود ہی کروں گی۔''

''بس۔'' نوراں نے فاطمہ کے دوٹوک لہجے سے حواس باختہ ہو کر کہا۔ اس لہجے کو اپنانے کی وہ کبھی جسارت نہ کر سکی تھی اور پھر فاطمہ کی عمر میں۔ خیر یہ بھی درست ہے کہ ان کا پس منظر ایک جیسا نہ تھا۔

''کسی شے کی خواہش ہو تو پھر اس کے لیے جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ یہی زندگی کا چلن ہے۔ میں تو اس شخص سے شادی کروں گی جو اس بات کو سمجھتا ہوگا۔''

''گویا تمہارے خیال میں ایسا شخص پیدا ہو چکا ہے۔'' لیلیٰ ہنستے ہوئے کہنے لگی۔

''میری سنو۔ میری شادی اپنے کزن علی سے ہونا تھی۔ ہم ایک دوسرے کو جانتے تھے اور چاہتے بھی تھے۔ اسے اور اس کے والدین کو یہ بات پسند نہ تھی کہ میں ملازمت کروں۔ لیکن میں سکول میں استانی بننا چاہتی تھی اور گھر میں رہ کر اپنی ماں کی طرح زندگی گزارنے سے مجھے وحشت ہوتی تھی۔ اس لئے ......''

''اس لیے......؟'' نوراں نے بے تابی سے پوچھا۔

''بھئی اس لیے میں تنہا ہوں۔ سکول ٹیچر ہوں لیکن تنہا ہوں۔ اور اگر میری ماں ساتھ نہ دیتی تو سکول ٹیچر بننے کے قابل بھی نہ ہوسکتی۔''

''تمہارے کزن کا کیا ہوا؟'' زہرہ نے پوچھا۔

''ارے اس نے ایک فرماں بردار عورت سے شادی بھی کر لی۔''

''اسے تم سے محبت نہ تھی۔'' فاطمہ نے دلیل گھڑی۔

''نہیں محبت تو تھی۔ اصل میں مسئلہ زیادہ پیچیدہ ہے۔''

یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگیں۔ لیکن اس کی ہنسی میں تلخی چھپی ہوئی تھی۔ وہ اپنی سہیلیوں کو فریب نہ دے سکی۔ فائزہ کو اس سے ہمدردی بلکہ شفقت کا احساس ہونے لگا۔

''تو تم واقعی شادی کرنا چاہتی تھیں۔''

یہ سوال فاطمہ نے کیا تھا جو ہمیشہ بات کے آخر تک پہنچنا چاہتی تھی حالانکہ بعض اوقات اسے معلوم نہ ہوتا تھا کہ بات کہاں تک جا پہنچے گی۔

''ہاں میں شادی کرنا، بچے پیدا کرنا اور اپنے پیشے میں کام کرنے کی خواہش مند تھی۔ لیکن ایسے مرد بہت کم ہیں جو بیوی کی ملازمت پر رضامند ہوں اور انہیں مساوی درجہ دینے پر تیار ہوں۔ میرے خیال میں تو وہ بزدل......''

وہ خاموش ہوگئیں۔ اس خاموشی میں ہزاروں خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے جن کا اظہار کرنا دشوار تھا۔ آخر نوراں نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے دھیمے پن سے کہا:

''ہاں میری بچیو۔ زندگی کٹھن ہے۔ ہم اکثر اوقات وہ کچھ نہیں کر سکتے جو کرنا چاہتے ہیں۔''

''ہم عورتوں کے لیے تو یہ واقعی کٹھن ہے۔'' زہرہ نے یوں کہا جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہو۔ ''زندگی کا م پر، شوہر کے ساتھ اور خاندان کے ساتھ-- ہر

جگہ کٹھن ہے۔ کبھی کبھی تو وہ اس قدر دشوار ہو جاتی ہے کہ جینا دوبھر ہو جاتا ہے۔''

''کیا تمہیں پتہ نہیں کہ یہ زندگی ہی ہے جو مشکل ہے۔'' نوراں نے اپنے الفاظ دہرائے۔ گویا وہ ابھی تک اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔

فائزہ اور لیلیٰ کو زیادہ ہی افسوس ہوا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ شاید نوراں کبھی تندرست نہ ہو سکے گی۔ دل ہی دل میں دونوں کو یہ جاننے کی خواہش تھی کہ آیا اس المناک دکھ کے ساتھ ساتھ نوراں کو زندگی میں خوشی کے لمحے بھی کبھی حاصل ہوئے تھے یا نہیں۔ یا یہ کہ اس کی زندگی کا مقصد محض یہ تھا کہ وہ بچے پیدا کرے اور دکھ سہتے ہوئے اس دنیا سے اٹھ جائے۔ وہ اپنے بچوں کے بارے میں بہت کم باتیں کرتی تھی۔ پھر بھی یوں لگتا تھا کہ دو بچوں نے اپنے آپ کو کچھ بنا لیا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ انہیں زیادہ پسند نہیں کرتی۔ البتہ سب سے چھوٹے بیٹے بشیر کی باتیں کیا کرتی تھی۔ بشیر کو اپنے والدین سے محبت تھی۔ یہاں تک کہ جب اس کا باپ کسی قدر مدہوشی کے عالم میں گھر آیا تھا تو بھی وہ اپنے باپ کی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ اگر اسے خدا پر یقین ہوتا تو وہ کامل ہوتا۔ لیکن اس نے کبھی مذہب پر عمل نہ کیا تھا۔ خدایا اسے معاف کر دینا۔ البتہ وہ کوئی غلط کام کبھی نہیں کرتا۔ کسی نے نوراں کو بتایا تھا کہ وہ سیاست میں حصہ لیتا ہے، مگر اسے معلوم نہ تھا۔ وہ اچھا بیٹا ہے اگر ان کے پاس مال وزر ہوتا تو وہ یقیناً بہت بڑا عالم بن جاتا۔ کیونکہ وہ بہت ذہین تھا۔ لیکن وہ مفلس تھے لہٰذا......

فاطمہ کو تو شکست کے احساس ہی سے نفرت تھی۔ اس نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا:

''اگر تمہاری سوچ ایسی ہے تو پھر تم کچھ نہیں کر سکتیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں تو ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتی۔ اور ہائی سکول میں ہم نے ایک دوسرے سے وعدہ کیا تھا۔''

''ہاں! شباب کے وعدے۔ لیکن زندگی میں ان کا کیا حشر ہوتا ہے؟'' نوراں کہہ رہی تھی ''تم یہ ماننے پر تیار نہیں ہو کہ زندگی ڈھلوان جیسی ہے۔ وہ ہمیں دور جا پھینکتی ہے۔''

''میں پھسلنا نہیں چاہتی۔ پیار کرنا اور کروانا چاہتی ہوں۔''

''اچھا جی۔ جیسے فلموں میں ہوتا ہے۔'' نوراں نے ہنستے ہوئے ہلکی سی طنز کی

MashalBooks.com

''محبتیں بھی مٹ جایا کرتی ہیں۔ جب وہ مٹ جائیں تو پھر؟ پھر یہ بھی ہے کہ آزاد عورتوں کو بھلا محبت سے کیا خوشی حاصل ہوگی۔ زندگی میں بڑی الجھنیں ہیں۔ ابھی تم چھوٹی ہو۔ اس بات کو نہ سمجھوگی۔''

''تم۔تم نے ہر شے کے ساتھ سمجھوتہ کیا ہے۔خیر ہم تو نہ کریں گی۔نہ۔نہ۔نہ۔ جو کچھ میرے بھائی کو کرنے کی اجازت ہے وہ میں بھی کروں گی۔ مجھے اس کے لیے مار پڑتی ہے لیکن میں پھر کرتی ہوں۔''

''تم ٹھیک ہو۔'' لیلیٰ نے ہنستے ہوئے کہا ''لیکن ذرا مار وار سے بچا کرو''

اس نے سوچا کہ اگر فاطمہ جیسی عورتوں کی تعداد زیادہ ہوئی تو حالات تیزی سے بدل سکتے تھے۔

''تم سے مجھے ڈر آتا ہے۔ میری بچیو ڈر۔ زندگی اس قدر پیچیدہ ہے۔ ہاں اگر وہ سادہ ہوتی، بہت سادہ، اس سے بھی سادہ جتنا کہ ہم سمجھتے ہیں تو......لیکن شاید ہم خود ہی زندگی کی الجھنوں میں اضافہ کرتے ہیں۔ خیر ہر شے آج کل اس قدر تیزی سے بدل رہی ہے کہ ہم اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ ہم گم ہو جاتے ہیں۔ گم۔''

علاج معالجے یا ہسپتال کے ضابطوں سے ان باتوں میں رکاوٹ پیدا ہوتی۔ لیکن چند گھنٹوں بعد یا دوسرے روز وہ ویسے ہی شروع ہو جاتیں جیسے کبھی ختم ہی نہ ہوئی ہوں۔ ان میں دو، تین، ، چار یا پانچوں عورتیں شریک ہوتیں۔ ہر مسئلے کا چرچا ہوتا۔ ہسپتال، بیماریوں اور گیتوں سے لے کر ایک دوسرے سے سنی سنائی کہانیوں تک کا۔ لیکن فاطمہ جو آزادی نسواں کی کم عمر حامی تھی اور مختلف عمر کی نئی سہیلیوں کے ملنے پر خوش تھی وہ استقلال اور اصرار کے ساتھ اپنی پسند کا موضوع چھیڑ دیتی۔ حال ہی میں اس نے سنا تھا کہ ایک نوجوان لڑکی کو اس کے باپ اور بھائی نے محض اس لیے مار مار کر ہلاک کر دیا تھا کہ ایک احمق ڈاکٹر نے کہہ دیا کہ وہ کنواری نہیں ہے۔ لیکن اس کے متعلق کیا ہوا۔ کچھ بھی نہیں۔ میں نے سنا تھا کہ ہائی سکول میں انہوں نے اس واقعہ کے متعلق ایک اشتہار شائع کیا تھا۔ لیکن حکومت نے اسے ضبط کر لیا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ڈاکٹر غلطی پر تھا۔''

''وہ غلط ہو یا درست، ہے یہ واقعہ خوفناک۔''

یہ تبصرہ زہرہ نے کیا تھا۔

''جب تک عورتوں کے ساتھ یہ سلوک ہوتا رہے گا، مساوات کا بول بالا نہ ہو گا۔''، لیلیٰ نے رائے دی۔

''جب میں یہاں ہسپتال آئی تو......'' فائزہ نے پہلے روز کا واقعہ یاد کرتے ہوئے کہا''میں نے ایک نوجوان لڑکی کو روتے چلاتے دیکھا۔ تین مرد اسے دھکے دے رہے تھے اور گالیاں بک رہے تھے۔''

''کاش ہم عورتیں ایک دوسرے کی مدد کریں اور مقابلے میں ڈٹ جائیں تو......'' زہرہ جو فاطمہ کے جوش وولولے پر ہمیشہ حیران ہوا کرتی تھی کہنے لگی۔

''ہماری فیکٹری میں بھی چندلوگ ہیں جو فاطمہ تمہارے جیسی باتیں کرتے ہیں۔ لیکن اس طرح حالات تو نہیں بدلتے۔ میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ جب جذبے بھڑک اٹھیں، جب ہر کوئی غیض وغضب سے بے قابو ہو جائے صرف تب ہی کوئی تبدیلی آتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی صرف ایسی آگ ثابت ہوتی ہے جو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ پھر حرارت بھی ختم ہو جاتی ہے۔''

''الجزائر اب انقلاب کی زد میں ہے۔ سکول میں میرے ایک ساتھی کا کہنا ہے کہ 'تمہیں صبر سے کام لینا چاہیے اور اپنے مسائل ایک ایک کر کے حل کرنے چاہئیں۔ آزادی کے بعد ہمارے ملک میں بہت سی ترقی ہوئی ہے۔ اب ہم سکول میں داخل ہو سکتے ہیں۔ یونیورسٹی جا سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ درست ہے لیکن سکولوں میں داخل ہونے والی بہت سی عورتیں بھی شادی کے بعد پرانے انداز کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ یہ بات واقعی بری ہے۔ اور جو نہیں جھکتیں ان پر اس قدر سماجی دباؤ۔''

''کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ ہم اس مصیبت سے کبھی چھٹکارا نہیں پا سکتیں؟'' فاطمہ نے لیلیٰ سے پوچھا جس کی تنہا عورت کے طور پر زندگی اس دنیا میں بے حد کٹھن تھی جہاں عورت کو غیر شادی شدہ رہنے کا حق نہیں دیا جاتا۔ اور روایت کا بندھن کبھی نہ ٹوٹے گا؟''

''نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں۔ بس صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ یہ نظام بہت سخت ہے اور اگر ہم اس کے خلاف لڑنے کی کوشش کریں تو زندگی زیادہ مشکل ہو جاتی ہے اور یہ کہ ہماری بہت سی بہنیں اس کے خلاف جدوجہد نہیں کر سکتیں۔ کاش تمہیں معلوم ہوتا اکیلی عورت کی حیثیت سے زندہ رہنا کتنا محال ہے۔ ہر طرف افواہیں گردش کرنے لگتی

ہیں۔ جب مجھے الجیرس سے ذرا فاصلے پر ہائی سکول میں پہلی ملازمت ملی تو کبھی کبھار رات کے وقت میرا جی سمندر کی طرف سیر کرنے کو چاہتا۔ دن بھر کے کام کاج کے بعد اس سیر کا بہت لطف آتا تھا۔ لیکن لوگوں کے دل میں یہ بات کھٹکنے لگی۔ پھر کیا تھا چند روز بعد پولیس کی ایک کار میرا پیچھا کرنے لگی۔ میری نگرانی کے لئے؟ میری حفاظت کے لئے؟ بچوں کے والدین نا قابل یقین افواہیں اور کہانیاں گھڑ لیں۔ شکر ہے میری شاگردوں کا جن کی مدد سے معاملہ صاف ہوا۔ اب وہ مجھے سمجھنے لگے ہیں، قبول کرنے لگے ہیں مگر اس کے لئے صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ چھوٹی سی غلطی بھی مہلک ثابت ہوسکتی ہے بڑی مشکل بات ہے۔ ذہن آہستہ، بہت آہستہ تبدیل ہوتے ہیں۔''

''لیکن تمہارا کیا خیال ہے کہ ہم حالات کو بدلنے کی خاطر وہ سب کچھ کر رہی ہیں جو کچھ کرنا چاہیے؟''

نرس ایک عورت کو بازو سے تھامے کمرے میں سے گزری جسے بظاہر اپنے آپ پر قابو نہ رہا تھا۔ نرس نے پانچ عورتوں کو اکٹھے بیٹھے دیکھا تو انہیں اٹھنے کا اشارہ دیا۔

''کیا ان کی ناخوشی کے سبب سے کوئی بے حال ہوگا؟ کیا تم ایسا سمجھتی ہو؟'' یقیناً۔ تم دکھ اٹھاتی ہو، اور دکھ اٹھاتی ہو۔۔ اور پھر ایک روز ختم ہو جاتی ہو۔''

ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگئیں۔

''میری ماں نے''، لیلیٰ نے خیالوں میں ڈوب کر کہنا شروع کیا ''حل تلاش کر لیا ہے۔ اپنی تمام توانائی برقرار رکھنے کی خاطر وہ دوسروں پر اچھل پڑتی ہے۔ مجھے تسلیم کرنا چاہئے کہ اس نے دکھ بھی بہت سہے ہیں۔ سولہ برس کی عمر میں شادی، گیارہ بچے، موت، جنگ اور پھر میرے باپ کی مار کٹائی۔ خیر وہ بھی کمینہ شخص نہیں تھا۔ اس کا حال ہی میں مجھے احساس ہوا ہے۔ ہم نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو دکھ دیتے ہیں۔''

''یہ سچ ہے'' زہرہ نے کہا ''ایک روز میں نے یہی بات اپنے خاوند کو بتائی تھی اور وہ چیخ اٹھا تھا۔

''ہم زندگی کو بدلنے کی شدید خواہش تو رکھتے ہیں، لیکن یہ سب کچھ ہوگا کیسے؟''

نوراں نے پیار سے فاطمہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا ''بیٹی جو کچھ تم کہتی ہو اس میں بڑی سچائی ہے۔ مگر تم بہت بھڑک چکی ہو۔ بڑی جلدی میں ہو۔ حالات کو سنورتے تو

بہت وقت لگتا ہے۔''

فائزہ نے نوراں کے خوبصورت، پرکشش اور سنجیدہ چہرے کو دیکھا اور اس کے لئے بے پناہ محبت محسوس کی۔ کاش اس کی ساس ایسی عورت ہوتی۔ باتیں کرنے کے لئے آنے والی ان چاروں عورتوں کے لئے اس کے دل میں ایسی محبت کا جذبہ بیدار ہوا کہ اس کی آنکھوں میں واقعی آنسو آ گئے۔

''یہاں ہم باتیں کرتی ہیں۔ایک دوسرے کی سنتی ہیں۔سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں اور اس سے بہت سا فائدہ بھی ہوتا ہے سسرال میں تو میں مہینوں سے بات بھی نہ کرسکی تھی۔''

چاروں عورتوں نے گرم جوشی سے فائزہ کی طرف دیکھا اور مسکرانے لگیں انہیں خود بھی احساس تھا کہ ایک دوسرے سے باتیں کرنے کے قابل ہونا، ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرنا اور آزادی سے خاندان یا دوسروں کی پابندیوں کے بغیر دل کی بات کہہ سکنا کس قدر اچھا ہے۔

''ابھی ایک دوسرے کو کہنے کے لئے ہمارے پاس بہت کچھ ہے۔ اس لئے یہاں مزید رہنے کی کوئی ترکیب سوچنا ہوگی۔'' فاطمہ یہ کہتے ہوئے زور سے ہنسنے لگی۔

''یہاں سے جانے کے بعد بھی ہمیں دوست رہنے کا وعدہ کرنا چاہئے۔''

''وعدہ رہا'' لیلیٰ، زہرہ اور فائزہ نے بے ساختہ کہا اور ہنسنے لگیں۔

''آہ یہ جواں لوگ۔ ہر وقت وعدے ہی کرتے رہتے ہیں۔''

''لیکن زندگی۔ خیر اگر ہم دوست رہ سکیں تو یہ اچھی بات ہی ہوگی۔'' فاطمہ نے نوراں کا منہ چوم لیا اور پھر فائزہ کی طرف بڑھی۔

''تمہیں دکھانے کے لئے میرے پاس کچھ ہے۔ وہی شے جو ہم سکول میں ایک دوسرے کو دیتے ہیں۔''

''سکول تم پڑھنے کے لئے جاتی ہو۔ ایسی باتوں کے لئے تو نہیں'' نوراں نے فاطمہ کی نقل اتارتے ہوئے کہا تو پانچوں عورتیں ہنسنے لگیں۔

''تم جواں لوگ، تم سمجھتے ہو کہ سب کچھ بدل سکتے ہو۔ لیکن زندگی۔ زندگی تو زمین کی طرح ہے جس سے کچھ حاصل کرنے کی خاطر محنت کرنی پڑتی ہے، وقت صرف ہوتا

ہے اور دعائیں مانگنی پڑتی ہیں۔''

زہرہ نے سوچا ''کاش دعاؤں سے کچھ بدل سکتا۔ لاکھوں دعائیں مانگی گئی ہیں لیکن۔'' نرس واپس آئی۔

''تم ابھی تک یہاں کیا کر رہی ہو؟ میں نے تمہیں اپنی اپنی جگہ واپس جانے کو کہا تھا۔ تھوڑی بہت بات تو قابل برداشت ہے مگر تم حد سے بڑھ جاتی ہو۔ تمہیں اچھی طرح پتہ ہے ڈاکٹروں کو یہ بات پسند نہیں ہے۔''

''وہ۔ وہ ہم تو وقت کاٹنے کے لئے ایسے ہی دو چار باتیں کر رہے تھے۔ اس طرح ہمارا حوصلہ بلند رہتا ہے۔''

''آؤ اب اٹھیں۔ چلو۔''

عورتیں چلی گئیں تو نرس سکون کے ساتھ فاطمہ کو سمجھانے لگی:

''سنتی ہو۔ تمہیں ابھی تک بخار ہے۔ آرام کرو۔ زیادہ باتیں کر کے خود کو جوش نہ دلاؤ۔ بہت باتیں کرتی ہو۔ اس لیے بخار ہو جاتا ہے۔ یاد رکھو جب تک بخار ختم نہ ہوگا۔ یہاں سے نہ جا سکو گی۔''

فاطمہ نے جاتے ہوئے فائزہ کو آنکھ ماری، خوش خوش اپنے بستر پر بیٹھی وہ مسکرانے لگی۔

فائزہ کو زہرہ بہت اچھی لگتی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ گہری باطنی زندگی کی حامل ہے۔ مستقل مزاج اور فیصلوں کی پکی ہے۔ اسے ناممکن کی آرزو نہ تھی۔ البتہ وہ سب کچھ حاصل کرنا چاہتی تھی جو ممکن ہے۔ وہ اور اس کا شوہر ایک ہی فیکٹری میں کام کرتے تھے۔

''بیوی تم پر راج کرنا چاہتی ہے اور تم جانو یہ اچھی بات نہیں ہے۔''

سبھی جانتے ہیں کہ جو خود محکوم رہ چکا ہو وہ جونہی انہیں آزاد کرنے کی کوشش کرے تو اس پر کسی اور کو محکوم بنانے کے درپے ہونے کا الزام لگا دیا جاتا ہے۔ گویا عورتوں اور مردوں کے مابین دوسرے رشتے، جیسے مرد مزدور، عورت مزدور اور فورمین، قائم کرنا محال ہو۔ میاں نے زہرہ سے طلاق چاہی تھی لیکن ابھی تک دونوں مل کر رہ رہے تھے۔ بڑی محنت اور صبر کے بعد زہرہ اپنے میاں سے اپنے تعلق کی نوعیت کو تبدیل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ ان کی شادی روایتی انداز میں طے پائی تھی۔ البتہ وقت کے ساتھ

MashalBooks.com

ساتھ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے تھے۔ ان کے مسائل اب بھی موجود تھے۔ لیکن مسائل کس کے پاس نہیں ہوتے؟ زہرہ منظّم انداز میں جھگڑوں اور حجت بازیوں سے بچتی رہی۔ وہ استقلال اور عزم کو ترجیح دیتی تھی۔ ''جب تک پھل پک نہ جائے اسے اتارا نہیں جاتا۔'' وہ یہ کہا کرتی تھی۔ فائزہ کا خیال تھا کہ زہرہ محض اس لیے اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی ہے کہ وہ شوہر کے ساتھ اکیلی رہتی ہے جب کہ ان دونوں کے گھر والے دور گاؤں میں رہتے تھے۔ دوسری وجہ یہ کہ دونوں کام کرتے تھے۔ زہرہ اس کی صورت حال میں ہوتی تو کیا کرتی؟ فائزہ کو اپنی زندگی، ہارون، محبت اور جنس کے بارے میں زہرہ سے تفصیل کے ساتھ باتیں کرنا پسند تھا لیکن اس کے لیے پہلے دوستی میں اضافہ ضروری تھا۔ دوسری طرف زہرہ اپنی صحت کے بارے میں پریشان تھی۔ اس نے فائزہ کو بچوں کے متعلق ایک کتاب لا کر دی تھی اور کہا تھا کہ وہ جاتے ہوئے اسے ساتھ لے جاسکتی ہے۔ پھر دونوں کہیں نہ کہیں تو ضرور دوبارہ ملیں گی۔ فائزہ نے اسے ہاں میں یوں جواب دیا تھا جیسے وہ اپنے تعلقات اور دوستوں کے انتخاب میں آزاد ہو۔

''تم دیکھو گی کہ کس قدر دلچسپ کتاب ہے۔ یہاں میرے پاس مطالعے کے لیے وقت ہے۔ گھر جانے کے بعد خدا جانے کب وقت ملے گا۔ اتنے کام ہوتے ہیں۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ وقت نکال لوں گی۔ کیونکہ تم جانتی ہی ہو کہ مطالعے کے ذریعے سب کچھ دریافت کیا جاسکتا ہے۔ ہاں سب کچھ۔ مطالعے سے ایسی باتوں کا پتہ بھی چلتا ہے جو نہ ٹیلی ویژن پر بتائی جاتی ہیں اور نہ ہی ریڈیو پر۔ بیماری بڑھتی ہی جارہی ہے اور مجھے ڈر ہے کہ لمبے عرصے تک بیمار نہیں رہنا چاہیے۔ سمجھ گئی ہو ناں؟ ہسپتال والوں کو ٹیسٹوں کی جلدی نہیں۔ لہٰذا مجھے انتظار کرنا پڑے گا۔ انتظار۔ ہر وقت انتظار۔ جیسے انتظار کے لیے میرے پاس وقت ہو۔ اور دولت بھی۔ مجھے یقین ہے کہ میں ملازمت کے سبب بیمار نہیں ہوئی۔ مجھے کام کی ضرورت ہے۔ مجھے افسوس ہے فائزہ۔ یہ روگ تو ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ آج میری طبیعت زیادہ خراب ہے۔''

زہرہ اپنے بستر کی طرف واپس چلی گئی۔ فائزہ سے دل کی بات کہہ کر وہ قدرے بے چین ہوگئی تھی۔ لیکن فائزہ مسکرا رہی تھی۔ وہ اس کے لیے اپنائیت کا احساس رکھتی تھی کیونکہ وہ اس قدر سمجھدار، حساس اور امیدوں سے بھرپور ہے۔ پھر بھی وہ بے چین

اور نا خوش ہے۔ وہ اس کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ لیکن کیسے؟ اسے لگتا تھا کہ جب تک کوئی بڑی تبدیلی نہ آئے فائزہ کی صورت حال ایسی ہی افسوسناک رہے گی اور یہ کہ اس صورت حال میں جو واحد مشورہ دیا جا سکتا ہے اس کے نتائج بہت سنجیدہ ہوں گے۔ اپنے تجربے سے زہرہ کو خوب معلوم تھا کہ ان کے معاشرے میں روایت سے بغاوت کرنا عورت کے لیے کس قدر دشوار ہے۔ ہاں اگر گھر کے افراد مدد کریں یا غیر معمولی طور پر سازگار حالات پیدا ہو جائیں تو اور بات ہے۔ اسے معلوم تھا کہ ذرا سی بے احتیاطی سے بنا بنایا کھیل خراب ہو سکتا ہے۔ ہر شے کو کھو دینے کے امکانات زیادہ تھے۔ جو کچھ ممکن ہو کرنا چاہیے مگر اس حد تک آگے نہ بڑھنا چاہیے کہ تصادم ہو جائے۔ فائزہ خود بھی اپنے مقاصد اور امکانات کے درمیان فاصلے پر غور کر رہی تھی۔ اسے تعجب ہوتا کہ ''میرے لیے ممکن کیا ہے؟ ہم تینوں کے لئے؟ ہارون کے لئے، میرے لئے اور ہونے والے بچے کے لئے؟'' پھر وہ دوبارہ زہرہ کے متعلق سوچنے لگی ''کاش اس کی بیماری قابل علاج ہو۔''

فاطمہ نے آ کر اس کے خیال کے دھارے میں رکاوٹ پیدا کی۔ وہ ہائی سکول میں شائع ہونے والے چند کتابچے لے کر آئی تھی جو ابھی اس کی سہیلیوں نے اسے دیے تھے۔

''ارے دیکھو، انہوں نے ہڑتال کر دی۔''

''ہڑتال۔''

''ہاں، وہ طبی معائنوں کو ختم کرانا چاہتے ہیں۔''

''طبی معائنے؟''

''ہاں، ہمارے کنوار پن کے تصدیق کے معائنے۔''

وہ ہنسی تو فائز بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکی۔

''مزدور عورتوں کی حمایت کی خاطر بھی انہوں نے ہڑتال کی ہے۔ باقی کا تم خود اندازہ کر لو۔ یہ نوراں تو کہتی ہے......''

''سکول تم پڑھنے کے لیے جاتی ہو۔ ہڑتال کرنے کی خاطر نہیں۔''

وہ پھر ہنسنے لگی۔ نرس اندر داخل ہوئی۔

''تم پھر یہاں ہو؟''

MashalBooks.com

فاطمہ جلدی سے واپس چلی گئی۔ کیونکہ نرس تیسری بار اسے متنبہ کر رہی تھی۔
فائزہ اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ جانتی تھی کہ فاطمہ پھر مڑ کر حسب معمول شرارت آمیز اشارہ دے گی۔ وہ دونوں ہم عمر تھیں لیکن ان کی زندگیوں میں کس قدر فرق تھا۔ فائزہ کو فاطمہ کی پرکشش، فعال اور ذہین شخصیت پسند تھی اور وہ جرات کے ساتھ ہر موضوع پر باتیں بھی کرتی تھی۔ جہاں تک فاطمہ کا تعلق ہے وہ نیا موقف اختیار کرنے کے قابل ہونے کو ناگوار خیال نہ کرتی تھی۔ شاید یوں کہنا چاہیے کہ یہ کام زیادہ مشکل کے بغیر ہی ہوسکتا تھا کیونکہ فائزہ کے لیے یہ تمام باتیں نئی تھیں۔ خوداعتمادی کے ساتھ فاطمہ جو موضوعات اٹھاتی فائزہ ان کے بارے میں پہلے سی کوئی طے شدہ خیالات نہ رکھتی تھی۔ فاطمہ کی اس خوداعتمادی کو لیلیٰ اور زہرہ ناپختگی قرار دیتی تھی۔ پھر بھی وہ سب کو اچھی لگتی تھی۔ فائزہ فاطمہ کا دیا ہوا کتابچہ پڑھنے لگی۔

''ہم سمجھتی ہیں کہ عورتوں کو حقیقی جمہوری حیثیت دلانے کے لیے عورتوں کو ہی اپنے حقوق کی حفاظت اور اپنی جدوجہد کی قیادت کرنی ہوگی۔''

فائزہ کی توجہ کم ہونے لگی تھی۔ یہ الفاظ، یہ جملے اس کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ اس سیاسی زبان اور روایت کی بظاہر پختہ دیوار کو مسمار کرنے کے لیے عورتوں کے پرجوش اتحاد کو سمجھنے کے لیے کسی نے اسے تیار نہیں کیا تھا۔

''ہم مذمت کرتی ہیں۔ ہم حقیقی طور پر ایسی منصفانہ سماجی حیثیت کا مطالبہ کرتی ہیں جس کے ذریعے عورتوں کو ان کے حقوق اور آزادیوں کے ساتھ ساتھ ان کی جائز آرزوؤں کے تحفظ کی ضمانت دی جائے اور انہیں طلاق دینے اور اپنے شریک حیات خود منتخب کرنے کا حق دیا جائے۔'' ہاں آزادانہ انتخاب۔ یہ بہت ضروری ہے۔ ''قانون کے خاتمے کے لیے۔'' اسے اس بات کی سمجھ نہ آئی تھی۔ اس نے خود سے کہا کہ وہ اس بارے میں لیلیٰ اور فاطمہ سے ذکر کرے گی۔ ''والدین اور ازدواجی سرپرستی کے خاتمے کے لیے۔'' - ''سرپرستی؟'' بظاہر یہ اچھی لگتی ہے لیکن اس کا ایک اور مفہوم بھی ہے جسے اس کے والدین نے مسترد کر دیا تھا۔ پڑھائی جاری رکھنے اور اپنی پسند کے شخص سے شادی کرنے کی اس کی خواہش۔ اس کے سسرال نے بھی شوہر کے ساتھ رہنے اور اپنی زندگیوں کے بارے میں خود فیصلہ کرنے کی اسکی خواہش مسترد کر دی تھی۔ ہاں۔ وہ یہ بات خوب سمجھتی تھی

لیکن اصطلاحات اس قدر تجریدی لگتی تھیں کہ انہیں اپنے تجربے اور جذبے سے ہم آہنگ کرنا اسے تقریباً ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کتابچہ بستر پر رکھ دیا۔ ہاں اگر وہ فاطمہ کی طرح ہائی سکول تک پہنچی ہوتی تو وہ بھی اس کو بہتر طور پر سمجھ سکتی تھی۔ اس کے بعد وہ کیا کرتی؟ یونیورسٹی؟ کیا پڑھنے کے لیے؟ یہ بات اس کے خاندان کی رسائی کے لیے اس قدر بعید تھی کہ وہ یہ سوچنے کے قابل بھی نہ تھی کہ اسے کیا کرنا پسند ہوتا۔ اور یہ فاطمہ؟ وہ فارماکولوجی پڑھنا چاہتی ہے۔ کیوں کہ اسے پسند ہے؟ یا محض اس لیے کہ اس کا باپ فارماسسٹ تھا؟ اور اگر اسے سکول سے ہی نکال دیا گیا تو؟ نوراں کا خیال ہے کہ وہ اس کی شادی کر دیں گے۔ فاطمہ نے فائزہ کو بتایا تھا کہ اس کے دو سال بڑے بھائی قادر کا اس کے باپ پر بہت اثر ورسوخ ہے لیکن باپ کو فاطمہ سے ہمدردی اس لیے ہے کہ وہ اس کے نقش قدم پر چلنا چاہتی ہے۔ جب کہ قادر کی دلچسپی بزنس ایڈمنسٹریشن میں ہے۔ کیونکہ جیسا کہ سب کو معلوم ہے بزنس ایڈمنسٹریشن کے مطالعہ سے آج کی دنیا میں شان وشوکت سے زندگی بسر کرنے کے تمام دروازے کھل جاتے ہیں۔ زبانی طور پر قادر عورتوں کے بارے میں ترقی پسند رویہ ظاہر کرتا۔ لیکن اپنی بہن پر کڑی نگاہ رکھتا تھا۔ اسے دعویٰ تھا کہ وہ بہن کو دوستوں کے ساتھ کیفے میں چائے پینے، سکول سے فارغ ہونے کے بعد اکیلے کہیں جانے اور بہت سی دوسری باتوں سے روکنے کا حق رکھتا ہے۔ وہ اس کی دوشیزگی کی حفاظت یوں کرتا جیسے یہ کوئی خاندانی خزانہ ہو۔ بہن بھائی میں جھگڑے اکثر اوقات شدید ہوتے۔ بسا اوقات تو وہ تھپڑ مارنے پر اتر آتا ہے اور ماں باپ پر زور دیتا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو فاطمہ کی شادی کر دی جائے۔ کیا وہ لمبے عرصے تک اس صورت حال کی مزاحمت کر سکتی ہے؟ کیا ماں باپ اس کا ساتھ دیتے رہیں گے؟ ایسا نہ ہوا تو اس کے تمام منصوبوں کا اور اس کے انحراف کا کیا بنے گا؟ فائزہ کو وہ تمام کہانیاں یاد آنے لگیں جو عائشہ انہیں، اسے اور ثمینہ کو ڈرانے اور آزادی کی ہلکی سی خواہش سے بھی ہٹانے کے لیے سنایا کرتی تھی۔ گھر گویا دارالنجات تھا اور تمام بلائیں اس کے دروازے کے باہر رک جایا کرتی تھیں۔ طوائف بننے کا اندیشہ سب سے زیادہ خوفناک تھا۔ لیکن عورت طوائف بنتی کیسے ہے۔ عائشہ کا واحد جواب یہ تھا کہ جو عورت روایت کا احترام نہیں کرتی اور بزرگوں کی بتلائی ہوئی راہ پر نہیں چلتی وہ بالآخر اس ہولناک صورت حال کا شکار ہو جاتی ہے۔ ''سنا ہے کہ

طوائفوں کے علاقے میں مرد سلاخوں والے دروازوں کے آگے سے گزرتے ہیں اور عورتیں انہیں دعوت گناہ دیتی ہیں۔ ایک بوڑھی نائکہ دروازے پر کھڑی رہتی ہے اور پیسے وصول کر کے مردوں کو اندر جانے دیتی ہے۔'' حمام میں عورتیں اس قسم کی کھسر پھسر کرتیں اور پھر انہیں ایسی باتوں پر شرمندگی بھی ہوتی۔ لیکن جب فائزہ نے یہاں یہی سوال پوچھا تو عورتیں ہنسیں نہ ہی پریشان ہوئیں۔ کسی شرم و حیا کے بغیر انہوں نے طوائفوں کے مسئلے پر سنجیدگی سے گفتگو کی۔

زندگی کے معاملات پر زہرہ، نوراں، لیلیٰ اور فاطمہ بڑی سنجیدگی سے باتیں کرتیں۔ ان کی باتیں سن سن کر فائزہ کو احساس ہونے لگا کہ اسے جان بوجھ کر اندھیرے میں رکھا جاتا رہا ہے جب کہ وہ خود سچائی کی متلاشی تھی۔ ظاہر ہے کہ زیادہ فرمانبردار اور زیادہ اطاعت شعار بنانے کے لیے جہالت سے کام لیا جاتا ہے۔ سچائی بلاشبہ بھیدوں سے بھرپور، پیچیدہ اور اکثر اوقات مخالفانہ روش کی حامل دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے، گھر والوں نے، معاشرے نے، سچائی کو اس سے چھپا رکھا تھا۔ یہاں تک کہ وہ جھوٹ سے بھی کام لیتے رہے تھے۔ لیکن اب وہ جھوٹ اور مکر و فریب کے خلاف جدوجہد کرنے کی گہری خواہش محسوس کرنے لگی تھی۔ ہر شے کے متعلق آزادانہ گفتگو کرنا مشکل تھا۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے کوئی ہمیشہ خوف کا اسیر رہے۔ سوال اٹھانے سے خوف کھائے۔ کسی پر اعتماد کرنے سے ڈرے، دروازوں سے گزرنے سے لرزے اور دل و جان سے جو کچھ کرنا چاہے، اسے کرنے سے خوف زدہ ہو۔ وہ خود بھی خوف زدہ تھی۔ لیکن اس کی زندگی کو جاننے کی خواہش، زندگی میں اعتماد اور مسرت کی آرزو خوف سے بھی زیادہ طاقتور تھی۔ اسے اپنی ان دوستوں سے قربت کا شدید احساس ہونے لگا جو خطرات پر پردے نہیں ڈالتی تھیں لیکن ان خطرات کو اپاہج کر دینے والی دہشت بھی نہیں بنا دیتی تھیں۔

لیلیٰ نے اسے بیا کی کہانی سنائی تھی۔ خود اسے بیا کی کہانی معلوم نہ تھی نہ ہی وہ بیا کی تصاویر سے آگاہ تھی۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ بچپن میں یتیم ہو جانے کے بعد بیا کو ایک فرانسیسی مصور کے پاس رہنا پڑا تھا۔ بالآخر وہ خود بھی مصوری کرنے لگی تھی۔ عائشہ نے یا اس کے خاندان کے کسی اور فرد نے بیا کی یہ کہانی نہیں سنائی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں جب اس کی عمر صرف سولہ برس تھی تو پیرس کی ایک بڑی آرٹ گیلری میں اس کی تصاویر کی نمائش

MashalBooks.com

ہوئی تھی۔ یہ ایک مشہور فرانسیسی شاعری آندرے بریٹن نے اس کی تصاویر کے کیٹلاگ کا دیباچہ لکھا تھا۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ وہ فرانس میں ولارس کے مقام پر ایک آرٹ سکول میں پہنچی اور شہرہ آفاق پکاسو سے ملی اور پھر اچانک گمنامی کے پردے میں گم ہوگئی۔ وہ ایک ایسے شخص کی دوسری بیوی بن کر رہ گئی تھی جس نے پہلے پہل اپنے بیٹے کے لیے اس کا رشتہ مانگا تھا۔ بیا نے چھ بچوں کو جنم دیا اور دوبارہ کبھی کوئی تصویر نہ بنائی۔ ہاں کبھی کبھار وہ دل بہلانے کو بُرش ہاتھ میں لے لیتی تھی۔ ۱۹۶۳ء میں دوبارہ اس کا شہرہ ہوا اور اسے ''عظیم مصورہ'' قرار دے دیا گیا۔ لیکن کسی نے کبھی اسے دیکھا نہیں۔ وہ روپ بدل کر، نقاب اوڑھ کر اپنے عزیزوں کی حفاظت میں اپنی نمائشوں پر آتی۔ بیا خاتون مصور گوشہ نشین ہو کر رہ گئی۔ بیا سب سے الگ تھلگ کر دی گئی۔ آج بھی ایسی باتیں کیسے ہو سکتی ہیں؟ بیا اور پکاسو کی تصویروں کو جاننے کی خواہش فائزہ کے اندر ہلچل مچانے لگی۔ ایک یتیم بچی جسے گھر کی جھاڑ پونچھ کے کام پر لگایا گیا تھا اور وہ مشہور مصورہ بن گئی۔ عورت مشہور آرٹسٹ بن سکتی ہے۔ عورت رقص کر سکتی ہے۔ گا سکتی ہے، لکھ سکتی ہے، جہاز اڑا سکتی ہے۔ عورت سب کچھ کر سکتی ہے۔ پھر خیالوں میں اس نے دیکھا کہ وہ خود بھی کام کر رہی ہے اور اس بات سے اسے خوشی ہوئی۔

بچے کی سلامتی کے لیے فائزہ کو بستر پر پڑے رہنے کی ہدایت کی گئی تھی لیکن اب وہ زیادہ بار اور زیادہ لمبے وقفوں کے لیے بستر سے اٹھنے لگی۔ اس کا وزن بڑھ گیا تھا۔ رنگ وروپ نکھر آیا تھا اور بھوک بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ اردگرد کی عورتوں کے لیے جو کچھ بھی ممکن ہوتا کرتی لیکن نرس بننے کی شدید خواہش اسے نہ تھی۔ ہسپتال میں زندگی گزار دینا اسے پسند نہ تھا۔ وہاں تو دکھ درد کی بہتات ہوتی ہے۔ ہسپتال میں ایک خاتون ڈاکٹر تھی جسے اس نے تقریباً کبھی نہ دیکھا تھا۔ البتہ لیبارٹری میں چند عورتیں کام کرتی تھیں۔ فائزہ کو ان پر ترس آتا۔ وہ خود کبھی ان تمام ٹیسٹ ٹیوبوں کا معائنہ کرنا اور بیماروں کے خون کا تجزیہ کرنا پسند نہ کرتی۔ لیکن ان پیشوں پر غور کرنے پر اسے حیرانی ہوئی گویا وہ اب بھی کوئی انتخاب کرنے کے قابل ہو۔

فاطمہ کے لائے ہوئے اخباروں کو وہ توجہ سے پڑھتی اور اس بات پر خوش ہوتی کہ اب وہ اخباروں کو چھپائے بغیر انہیں پڑھ سکتی ہے۔ وہ اس خیال کو پوری قوت سے

جھٹک دیتی کہ جلد ہی پابندیاں پھر سے شروع ہو جائیں گی۔

اس نے تارک وطن محنت کشوں کے متعلق ایک مضمون کاٹ کر رکھ لیا۔ 'مرد رعایتی قیمت پر' یہ ایک دل ہلا دینے والا عنوان تھا۔ ''یہ لوگ جنہیں زندہ رہنے کے بنیادی حق سے محروم رکھا گیا ہے۔ جنھیں ملکی قانون نے فراموش کر دیا ہے، جن کو معاوضہ بہت کم ملتا ہے، جو ناموزوں گھروں میں رہتے ہیں، پولیس جن کا پیچھا کرتی رہتی ہے اور جو عظمت رفتہ کے خواب دیکھنے والوں کی نفرت کا مرکز بنتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو فرانس، برطانیہ اور دوسرے ملکوں کی دولت کا ایک بڑا حصہ پیدا کرتے ہیں۔'' اس نے بار بار یہ مضمون پڑھا۔ اسے خوب معلوم تھا کہ ہارون بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ایک ہے۔ یادوں کا سیلاب امڈنے لگا اور جذبوں، جھگڑوں، غلط فہمیوں اور انہونیوں کے تمام گمبھیر لمحے آنکھوں کے آگے گھومنے لگے۔ اس نے پہلی رات ہارون کو کمرے کی طرف آتے دیکھا۔ اپنی ماں کے ساتھ اسے انجیر کے درخت کے نیچے بیٹھے دیکھا۔ ان کی باہمی محبت اور افہام و تفہیم کو دیکھا۔ پھر اس نے وہ لمحہ دوبارہ محسوس کیا جب اسے تھپڑ مارا گیا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے جسم پر ہارون کا بوجھ بھی محسوس کیا۔

اس اثنا میں ہارون اجنبی ہی رہا۔ اس کی یاد فائزہ میں اس قدر متصادم احساسات کو جنم دیتی تھی کہ وہ خود ان کی بھول بھلیوں میں کھو جاتی۔ اس نے روانگی سے ایک رات پہلے کی ہارون کی آواز سنی ''تم نہیں سمجھ سکتی ہو۔'' یقیناً یہ اس کا مضبوط ترین تاثر تھا۔ وہ سمجھ نہیں سکتی تھی۔ وہ سب کچھ سمجھنا چاہتی تھی۔ اپنی بغاوت، اپنی آرزوؤں، اپنے جسم، اپنے دل اور اپنی زندگی۔ ہر شے کو جاننے کی خواہش۔ وہ ہارون کو اور خود اپنے آپ کو سمجھنا چاہتی تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ زندگی کو بدلنے کی خاطر اسے کیا کرنا ہوگا۔ اس آرزو نے اس کی روح میں آگ لگا دی تھی اور وہ ان تمام دروازوں کو کھول دینا چاہتی تھی جو اس پر بند رکھے گئے تھے۔ پھر وہ متوقع بچے کے متعلق سوچنے لگی۔ وہ اس کے پیٹ میں ہونے کے باوجود ابھی تک اجنبی تھا۔

ہسپتال میں فائزہ کو اب صرف چند دن اور ٹھہرنا تھا۔ اس نے ہارون کو خط لکھنا چاہا۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ لکھتی اور خود ہی پھاڑ دیتی۔ اسے وہ یاد آتا کہ وہ کس قدر ناقابل رسائی، بند اور حکم چلانے والا ہے۔ کبھی کبھار نرم پڑنے کے باوجود وہ بھید ہی

MashalBooks.com

رہتا۔ اکثر وہ خوابوں میں اسے اپنی پسند کے قالب میں ڈھال دیتی۔ انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام رکھے ہیں۔ ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی چاہت میں سرشار ہیں۔ وہ برقع پہنے بغیر گھر سے باہر جا سکتی ہے۔ کام کر سکتی ہے۔ پھر اچانک حقائق اس کے خوابوں کے گھروندوں کو مسمار کر دیتے اور وہ نامکمل، ادھورا رہ جانے والا خط پھاڑ دیتی۔

محبت اور گرم جوشی والی مسکراہٹ کے ساتھ وفادار دوست رہنے کا وعدہ کرتے ہوئے اور اپنا پتہ چھوڑ کر فاطمہ ہسپتال سے چلی گئی۔ زہرہ کو کسی اور وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ جیسا کہ نوراں نے شبہ ظاہر کیا تھا۔ اس کا خون کیمیکل اشیا کی وجہ سے زہر آلود ہو گیا تھا۔ اس کے علاج پر طویل وقت صرف ہونا تھا۔ یہ اطلاع پا کر پہلے تو اسے مایوسی اک شدید دورہ پڑا۔ لیکن اس نے اپنی مخصوص قوت ارادی سے خود کو سنبھالا اور اپنی تمام قوت وہ سب کچھ کرنے پر مرکوز کر دی جو اسے علاج کی خاطر کرنے کو کہا گیا تھا۔ علاج کی خاطر وہ تندرست ہونا چاہتی تھی اور اس مقصد کے لیے بس ایک ہی چارہ تھا اور وہ یہ کہ وہ آنکھیں بند کیے ہسپتال والوں کی ہدایت پر عمل کرتی رہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہ تھا کہ وہ اپنے گھر کے پاس اس واحد فیکٹری میں کام کرتی رہے جس میں عورتوں کو کام پر رکھا جاتا تھا۔ اس نے اپنا کام خود تو منتخب نہ کیا تھا۔ یہی بات لیلیٰ نے فائزہ کو اس وقت بتائی تھی جب وہ دونوں آخری بار ہسپتال کے صحن میں چہل قدمی کر رہی تھیں۔ اسی شب لیلیٰ ہسپتال سے روانہ ہو گئی۔ دوسرے روز فائزہ نے ہسپتال کو خیرباد کہہ دیا۔

''ہم اپنی آزادی کی آرزومند ہیں۔ لیکن زندگی ہمیں گزارے چلی جاتی ہے۔ اور اسے تبدیل کرنے کے قابل ہوئے بغیر۔''

فائزہ سوچ رہی تھی ''ہم دوبارہ کب ساتھ مل کر چل سکیں گے؟''

نوراں کا دوبارہ آپریشن ہوا تھا۔ اس کی حالت کافی نازک تھی اور اس بات نے سب کو اداس کر دیا تھا۔ نوراں نے زندگی کی دوسری تمام باتوں کی طرح اپنی بیماری کو بھی صبر سے قبول کر لیا اور موت آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگی۔ فرار کی کوئی راہ نہ تھی۔

ہاتھوں میں ہاتھ دیے فائزہ اور لیلیٰ ہسپتال کے صحن میں ٹہل رہی تھیں۔ وہ

MashalBooks.com

دوست بن چکی تھیں اور اس دوستی کو ایسی شاندار شے خیال کرتی تھیں جس کو محفوظ رکھنے کی کوئی نہ کوئی راہ تلاش کی جائے۔

وہ ایسی عورتوں کے قریب سے گزریں جو خاص دشواری سے دوبارہ چلنا سیکھ رہی تھیں اور ہر قدم احتیاط سے اٹھاتی تھیں۔ بینچ پر ایک جوان اور ایک عمر رسیدہ عورت بیٹھی تھیں۔ لگتا تھا کہ وہ دونوں حقیقت کی دنیا کو چھوڑ کر ہذیان کی دنیا میں پناہ لے چکی ہیں۔ تھوڑے فاصلے پر لڑکیاں ناچ رہی تھیں۔ فائزہ اور لیلیٰ ان کے پاس گئیں اور تھاپ پر تالیاں بجانے لگیں۔

MashalBooks.com

حمیرہ اور جمال فائزہ کو ہسپتال سے لینے آئے اور ٹیکسی میں اسے گھر لے گئے۔ عائشہ اور ثمینہ گھر میں رہیں اور ان کے استقبال کے لیے اچھے اچھے کھانے تیار کرتی رہیں۔

''اب سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے میری جان۔ بالکل ٹھیک۔'' حمیرہ نے یہ اعتماد بڑھانے والا جملہ کئی بار دہرایا۔ وہ اپنی بیٹی کو تندرست اور ٹھیک ٹھاک دیکھ کر بہت خوش تھی۔ اور شکر ہو خدا کا کہ بچہ بھی محفوظ تھا۔

جمال صرف ایک بار فائزہ کو دیکھنے ہسپتال آیا تھا۔ اب جو اس نے فائزہ کو دیکھا تو وہ پہلے سے بدل چکی تھی۔ وہ رک کر چند لمحوں کے لیے مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ فائزہ اب پہلے سے زیادہ صحت مند دکھائی دیتی ہے اور اہم بات یہ ہے کہ اب اس کے چہرے پر اداسی کا تاثر کم ہے اور آنکھوں میں ایسی چمک آ گئی ہے جس کو دیکھنے کا اسے لطف آ رہا تھا۔

فائزہ ٹیکسی میں خاموش بیٹھی رہی۔ بس دھوپ میں نہائے ہوئے پرشور اور پرکشش شہر کو دیکھتی رہی۔ ایک پل کے لیے تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی طویل سفر سے واپس آئی ہو اور شہر کو از سر نو دریافت کر رہی ہو۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی ان تمام لوگوں کی طرح گھومے پھرے جو ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ اس خواہش کے ساتھ ہی اسے اپنے اندر خلاء کا احساس ہوا۔ وہ اپنے سسرال واپس جا رہی تھی۔ اس گھر کی طرف جسے اس نے کم و بیش فراموش کر دیا تھا۔ بکھری ہوئی یادوں کو اس نے ایک بار پھر سمیٹا تھا۔ یہ سب کچھ بہت عجیب اور تکلیف دہ لگ رہا تھا ''سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے میری جان، سب کچھ'' اس کی ماں کی آواز یقین دلا رہی تھی۔ گلیوں میں عورتیں سبزیوں، پھل اور کپڑوں سے لدی ہوئی ٹوکریاں اٹھائے تیز تیز قدم اٹھا رہی تھیں اور توانائی سے بھرپور شرارتی بچے ہنستے کھیلتے ان

کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔لوک رقص کے ایک پروگرام کے بڑے بڑے پوسٹر دیواروں پر چسپاں تھے۔لڑکے لڑکیوں پر آوازے کس رہے تھے جوان سے بے نیاز اپنی منزل کی طرف چلی جارہی تھیں۔ہائے یہ شہر۔

فائزہ اب دیکھ نہیں رہی تھی۔سسرال کی طرف واپسی اور آنے والے دنوں کے اندیشوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔کاش حالات بدل گئے ہوتے۔مگر وہ ابھی سے عائشہ کی تیار کردہ روزمرہ زندگی کے ناقابل تغیر دلدل میں خود کو پھنسا ہوا محسوس کرنے لگی تھی۔

''ہم یہاں ہیں میری جان۔ہم یہاں ......''

جمال گاڑی کے شیشے میں سے بھابی کو دیکھ رہا تھا۔چند لمحوں میں اس کا چہرہ سکڑا اور آنکھوں کی چمک گم ہوگئی۔لگتا تھا کہ اس کی آنکھیں اب اپنے باطن میں اپنے تکلیف دہ تصورات کو جھانک رہی ہیں۔وہ سمجھ گیا کہ فائزہ گھر واپس جانے پر خوش نہیں ہے۔اس بات پر اسے یوں افسوس ہوا جیسے فائزہ نے اپنا کرب اور اپنی تشویش براہ راست اسے منتقل کردی ہو۔

عائشہ دہلیز میں کھڑی ویسے ہی انتظار کررہی تھی جیسے وہ پہلے اپنے بیٹے کا انتظار کر چکی تھی۔ثمینہ نے فائزہ کو آتے دیکھا تو بچوں کے ساتھ بھاگ کر اس کی طرف لپکی۔

پھر تقریب شروع ہوگئی جس میں گرم جوشی تھی اور بے ساختگی بھی۔ان کے تخیل کو آگ سی لگ رہی تھی۔عائشہ اور حمیرہ دونوں کو یقین تھا کہ اب جب کہ فائزہ حقیقی معنوں میں عورت بن گئی ہے تو صورت حال بدل جائے گی۔وہ اپنی نئی زندگی کو قبول کرلے گی اور ماں بننے کے قابل ہوسکے گی۔ان کے نزدیک مستقبل پرسکون اور خوشیوں سے بھرپور تھا۔ عائشہ پچھلے تمام جھگڑے بھول چکی تھی اور خوش گوار موڈ میں تھی۔اب اسے فائزہ کی ماں سے بھی کوئی گلہ نہ تھا اور دونوں عورتیں خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ہنس رہی تھی، کافی پی رہی تھیں۔ثمینہ کا تو یہ حال تھا کہ وہ فائزہ کی واپسی پر خوشی سے نڈھال ہوئی جارہی تھی۔ چپکے چپکے اس نے فائزہ کو یہ بھی بتادیا کہ اس کی غیر حاضری میں اس نے بہت محنت کی ہے اور پڑھائی میں آگے بڑھی ہے۔فائزہ نے خود بھی تقریب کا حصہ بننا چاہا لیکن وہ دل و جان سے خوشی محسوس نہ کرسکی۔وہ حقیقت کو کسی فریب کے بغیر دیکھ رہی تھی۔کچھ بھی تو تبدیل نہ ہوا تھا۔کچھ بھی تبدیل نہ ہوگا۔اسے پہلے کی طرح ثمینہ کو چوری چھپے پڑھانا ہوگا،

برقع پہننا ہوگا۔ گھر کی چار دیواری میں قید رہنا ہوگا۔ جب تک وہ اپنی پوری قوت سے تبدیلی نہ چاہے گی اور اپنے اندر تبدیلی کے لیے قوت اور وسائل تلاش نہ کرے گی، کچھ بھی تبدیل نہ ہوگا۔ لیکن یہ سب کچھ کیسے ہوگا؟ فائزہ خود کو دوبارہ اسی گھر میں پا رہی تھی جس میں وہ خوش نہ تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ عائشہ کی خوشی دیرپا نہ ہوگی کیونکہ ان دونوں کے اختلافات کے سبب کو الہ دین کے کسی چراغ نے ختم نہیں کر دیا۔ وہ اب بھی اپنی جگہ موجود ہیں۔ فائزہ کا طرزِ احساس بدل گیا تھا لیکن یہ تبدیلی ویسی نہ تھی جیسی اس کی ساس چاہتی تھی۔ ہسپتال سے وہ نئے تعلقات، نئی دوستیوں اور نئے شعور سی لدی پھندی واپس آئی تھی اور روایتی ڈگر پر چلنے کے لیے پہلے سے بھی زیادہ نااہل ہو چکی تھی۔

جمال زیادہ دیر تک وہاں نہ ٹھہرا اور جاتے ہوئے فائزہ کو ایک دوستانہ اشارہ دے گیا جس کا مطلب یہ تھا کہ 'میرے پاس تمہارے لیے کچھ ہے۔' فائزہ اس پر مسکرا دی تھی۔

حمیرہ بھی خوشی اور اعتماد کے ساتھ واپس چلی گئی۔ اس نے دوبارہ جلد آنے کا وعدہ کیا اور لمحے کی مسرت میں گرفتار عائشہ نے بھی رضامندی ظاہر کر دی۔

سارا دن تقریب کی نذر ہو گیا۔ شام کو جب احمد کام سے واپس آیا تو اس نے فائزہ کو دیکھا جو بدلی بدلی سی لگتی تھی۔ وہ زیادہ سندر دکھائی دیتی تھی اور احمد کو سیدھی نظروں سے دیکھنے کا حوصلہ بھی رکھتی تھی۔ اس نے بھینچ کر فائزہ کو گلے لگا لیا تو فائزہ کو یوں لگا جیسے وہ اپنے ہونے والے پوتے کو گلے لگا رہا ہو۔ ہاں وہ پوتے کا خواہش مند تھا۔ پہلے بچے کو تو بیٹا ہی ہونا چاہیے۔

اس شب وہ جلد ہی بستر میں گھس گئے۔ احمد نے زیادہ آزادی کے ساتھ اپنی بیوی سے وہی جملہ کہا جو حمیرہ کئی بار دہرا چکی تھی:

''اب سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔ سب کچھ!''

عائشہ نے بھی اتفاق کیا۔ وہ پوری طرح مطمئن تھی۔

فائزہ نے واپس آتے ہوئے جو بے چینی محسوس کی تھی اور جس کو صرف جمال ہی محسوس کر سکا تھا، وہ زیادہ دیر تک برقرار نہ رہی۔ درحقیقت ہسپتال جانے سے پہلے کے مقابلے میں فائزہ اب خود کو زیادہ توانا محسوس کرتی تھی اور اس کی اداسی ختم ہو چکی تھی۔ اس

نے اپنی نئی سہیلیوں کے بارے میں بہت کچھ سوچا اور ان سے دوبارہ ملنے کے طریقوں پر غور کرتے ہوئے بھی مایوسی کا شکار نہ ہوئی۔ سب سے انوکھی اور اہم بات تو یہ ہے کہ اب اس نے ایسی عورت کی حیثیت سے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا جو ماں بننے والی ہو۔ ہونے والا بچہ اب بے معنی نہ رہا تھا۔ فائزہ نے اس کے وجود کو بالآخر تسلیم کر لیا تھا۔ وہ اس کی پیدائش کی منتظر تھی۔ اور یہ دھندلا مستقبل ان دونوں کے لئے منصوبوں سے بھرپور تھا۔ ان باتوں نے فائزہ کو اس کی وہ بھوک لوٹا دی جو وہ صرف شادی سے پہلے ہی محسوس کیا کرتی تھی۔ اس طرح اس کا رنگ روپ اور زندگی کی چھوٹی چھوٹی مسرتیں بھی پھر سے لوٹ آئی تھیں۔ اس ہم آہنگی کے باوجود اسے اس خلیج کا بھرپور شعور تھا جو ہارون اور اس کی ماں کو اس سے جدا کرتی تھی۔ مسئلہ محض یہ نہ تھا کہ وہ اور ہارون دو ایسی شخصیتیں تھیں جو ایک دوسرے کی ضد ہوں۔ بات اس سے زیادہ تھی۔ ان کی امنگیں، ان کے خواب، ان کی ضرورتیں بھی ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔

عائشہ ننھے علی کو گود میں لیے انجیر کے درخت کے نیچے بیٹھی تھی۔ اس نے بچے کو چوما اور منہ ہی منہ میں بولی:

''میرے شہزادے۔ میرے چھوٹے صاحب۔ ماں کا چھوٹا صاحب کون ہے؟ سب سے پیارا کون ہے؟ علی ہے۔علی ہے۔''

بچے نے اسے چوما اور پیار سے چمٹ گیا۔

''ابا کی طرح چھوٹا صاحب کون ہے؟''

اسی وقت احمد کام پر جانے کے لیے صحن میں سے گزرا۔ ''رات کو گوشت لانا نہ بھول جانا۔'' عائشہ نے اسے خدا حافظ کہتے ہوئے یاد دلایا۔ ''بھئی ہم روز تو گوشت نہیں کھا سکتے۔ وہ اس قدر مہنگا ہے۔ تمھیں پتہ ہی ہے۔''

''اچھا اچھا۔ میں مٹر پکا لوں گی۔ ہاں۔تم نے مجھے ایک جوڑا کپڑوں کا لا کر دینا تھا۔ یاد ہے نا۔ میرے کپڑے اس قدر واہیات ہو گئے ہیں۔ سکندر سے تم تھوڑے سے پیسے ادھار لے لو۔''

''تم جانتی ہو سکندر مجھے کچھ نہیں دیتا۔ وہ تو کسی کو بھی ادھار نہیں دیتا۔ اس لیے کہ وہ امیر ہے پھر وہ ہر بات کا بہت غور سے جائزہ لیتا ہے۔ بی بی بس ذرا تم انتظار کر لو۔ ہم پہلے ہی بہت خرچ کر چکے ہیں۔''

''آہ۔ اگر تم میری سنتے، اگر تم مان جاتے۔'' احمد چڑ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اسے خوب معلوم تھا کہ عائشہ کیا کہنا چاہتی تھی۔

''کاش تم اپنے چچا سے رقم ادھار لینے پر تیار ہو جاتے۔ آخر تمہارے بھائی کو بھی تو اس نے قرض دیا ہے۔''

احمد یہ جملہ سننے سے پہلے ہی باہر نکل چکا تھا۔ لیکن عائشہ یوں بول رہی تھی، جیسے

MashalBooks.com

وہ اس کی بات سن رہا ہو۔

''اب وہ ایک کیفے کا مالک بھی بن گیا ہے۔ ہم سے تو اب بات ہی نہیں کرتا۔ گردن اکڑائے پھرتا ہے۔ اور ہم؟ اس کی بیوی کو تو اب آنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔''

علی ماں کو چھوڑ کر نفیسہ کا گیند پکڑنے اس کی طرف دوڑا عائشہ درخت کے نیچے ہی بیٹھی رہی۔ لیکن جیسا کہ اس قسم کے لمحات میں ہمیشہ ہوتا ہے اس کے خیالات تیزی سے گردش کر رہے تھے۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی، پھٹے پرانے کپڑے۔ شوہر کی بے حسی۔ روزمرہ کی مشکلات۔ ہارون پردیس میں ہے۔ بچوں کی پرورش ابھی کرنی ہے۔ جمال ہے۔ فائزہ ہے۔ گو پہلے سے بہتر ہے لیکن کب تک؟ ثمینہ کی شادی بھی جلد ہی کرنی ہوگی۔ یہ تمام باتیں اسے تکلیف دینے لگیں۔ اسے ان سارے معاملات پر کوئی حقیقی اختیار نہ تھا۔ لیکن یہ سب باتیں اس صبح کیوں یاد آ رہی ہیں؟ اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ اس قسم کے ناگوار موڈ اس پر اچانک طاری ہو جایا کرتے تھے۔ عائشہ کو اس کا سبب معلوم نہ تھا۔ پھر بھی انہیں برداشت کرنا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اس قسم کے ناگوار موڈ کا غصہ دوسروں پر نکالتی تھی۔ علی پر نہیں کہ وہ ابھی بچہ تھا اور جمال پر بھی نہیں کہ وہ اب جوان ہو چکا تھا۔

اسی روز جمال کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ وہ فائزہ اور ثمینہ کو لے کر حمام جائے۔ فائزہ کو اسی طرح جمال کے ساتھ جانا مضحکہ خیز لگا لیکن اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ ویسے بھی اسے جمال اور ثمینہ کے ساتھ باہر جانا ناگوار نہ تھا۔ اس کے برعکس وہ تینوں اس بات پر خوش تھے۔ یوں انہیں آزادی سے باتیں کرنے کا موقع بھی مل گیا اور وہ سوچنے لگے کہ جمال فائزہ اور اس کی سہیلیوں کے درمیان کس طرح رابطے کا کام دے سکتا ہے۔ شاید وہ حمام میں ایک دوسرے سے مل سکتی تھیں۔ مگر اس کے لیے پہلے سے تیاری کرنی ہوگی۔ جمال مدد دینے پر آمادہ ہو گیا۔ طے یہ ہوا کہ پہلے وہ فاطمہ سے رابطہ قائم کرے گا۔ یہ معاملہ سب سے آسان بھی تھا کیونکہ وہ دونوں ایک سی عمر کے تھے اور انہیں ہائی سکول کے طالب علموں والی آزادی بھی حاصل تھی۔

فائزہ اور ثمینہ کو ٹرکش حمام پسند تھے۔ وہاں کا ماحول خوش گوار اور آزادانہ ہوتا ہے۔ وہاں کسی رکاوٹ کے بغیر باتیں ہو سکتی ہیں اور خاندانی راز ایک دوسرے کو بتائے جا سکتے ہیں۔ روپے پیسے کے جھگڑے۔ نظر انداز ہونے والی بیوی کے رنج والم۔ دوسرے کی

MashalBooks.com

فضول خرچی اور سکینڈل ایک دوسرے کو بتائے جا سکتے ہیں۔ پھر بھی وہ حزن و ملال کا سبب نہیں بنتے۔ ٹرکش حمام کا ماحول ہی ایسا ہوتا ہے۔ وہ آرام، جسمانی مسرت، ہنسنے کھیلنے اور گپیں لڑانے کے لیے ہی بنے ہیں۔ ان حماموں میں جنم لینے والی محفلیں اس سے بالکل مختلف ہوتی ہیں جس کا سامنا فائزہ کو ہسپتال میں کرنا پڑا تھا۔ یہاں اس نے جو کچھ سنا اس سے پرانے زمانے کے رسوم و رواج کے خلاف بغاوت کی کوئی بو موجود نہ تھی۔ عورتیں ایک دوسرے کے متعلق اس لیے زیادہ باتیں کرتی تھیں کہ وہ اپنے متعلق کم سے کم باتیں کر سکیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے دل بہلا کر وہ بنیادی معاملات سے آنکھیں چرا لیتیں۔ اگر وہ حقیقت کو ہی پیش نظر رکھتیں تو عورتوں کی زندگی تیزی سے تبدیل ہو سکتی تھی۔ ہسپتال میں تعلقات کی یہی وہ صفت تھی جس پر فائزہ کو تعجب ہوا تھا اور وہ اسے پسند بھی کرتی تھی کیونکہ اس سے اس کی گہری ضرورتوں کی تسکین ہوئی تھی۔ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ ہسپتال دکھ درد، خوف اور جواب سے محروم سوالات کا مقام ہوتا ہے؟

چالیس سال کی ایک حاملہ عورت کو فائزہ نے دیکھا جو گرمی اور بھاپ سے نڈھال دکھائی دیتی تھی۔ اس کے گرد چار، پانچ، چھ بچے تھے۔ اس کے اپنے؟ ''عورت کے پانچ بچے نہ ہوں تو وہ عورت ہی نہیں ہوتی۔'' عائشہ یہ جملہ بار بار دہرایا کرتی تھی۔ جب کہ فائزہ نے زہرہ کو بتایا تھا کہ وہ کسی مزید بچے کی خواہش مند نہیں۔

''اچھا پھر تمہیں ڈاکٹر سے مل کر دوا لینی ہوگی۔ وہ تمہیں سب کچھ بتا دے گا۔ ہر روز تمہیں ایک گولی کھانی ہوگی اور ہرگز نہ بھولنا ورنہ جڑواں بچے ہو سکتے ہیں۔''

دونوں ہنس پڑیں، لیکن اس کام کے لیے وہ ڈاکٹر کے پاس کیسے جا سکتی تھی؟ پھر یہ بھی تھا کہ خاوند ساتھ نہ ہو تو بہت سے ڈاکٹر اس معاملے میں دوا دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ کیا یہاں موجود عورتوں کو اس گولی کا کچھ علم نہ تھا؟ کیا انہوں نے استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا؟ یا وہ خوف زدہ تھیں؟ شاید ان کے خاوندوں یا گھر والوں نے انکار نہ کر دیا ہو؟ فائزہ یہ سوال ان سے پوچھنا چاہتی تھی۔ عورتیں ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ پوچھتی ہی رہتی ہیں۔ پھر اسے یاد آیا کہ عائشہ نے کچھ عرصے پہلے غصے میں آ کر ایک عورت کو گھر سے نکال دیا تھا حالانکہ وہ اس قسم کے سوال نہیں پوچھ رہی تھی۔ وہ تو صرف تعلیم کے بارے میں سادہ سی باتیں جاننا چاہتی تھی۔

جب وہ حمام سے نکلیں تو جمال دیوار سے ٹیک لگائے بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔
''ارے تم تینوں کو واپسی یاد ہی نہ تھی۔''
لڑکیاں ہنسنے لگیں۔
''ہم تینوں؟ کیا مطلب؟''
''یہ لڑکا تو گرم ہو گیا ہوگا۔''
''لڑکا کیوں؟ لڑکی بھی تو ہو سکتی ہے۔''
''لڑکے کو جنم دینا تمہارے اپنے مفاد میں ہے۔ امی اور ابو بھی اسی کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔''
''جانتی ہوں۔ جانتی ہوں۔ لیکن ہوگا تو وہی جو ہونا ہے۔ رہی میں تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''
جمال نے تو یہ بات محض ترغیب دلانے کے لیے کہی تھی لیکن فائزہ بڑے خوش گوار موڈ میں تھی۔
''اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ اب میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ تمہیں میری اطاعت کرنی ہی ہوگی۔''
اس کے ساتھ ہی وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔
''لیکن'' ثمینہ کہنے لگی ''یہ راستہ گھر کی طرف تو نہیں جاتا۔''
''بس میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ بولنے کا تمہیں کوئی حق نہیں۔''
وہ ہنسنے لگا اور دونوں حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔
''بات کیا ہے؟ تمہیں کس نے کہا ہے کہ ہم گھر جا رہے ہیں۔''

MashalBooks.com

''پھر کہاں جا رہے ہیں؟'' ثمینہ کی حیرانی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ رک گئیں اور جمال کو بھی رکنا پڑا۔

''بس یہ ایک راز ہے۔آ ؤ، چلی آ ؤ۔''

فائزہ اور ثمینہ نے تذبذب کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھا اور اپنی جگہ پر ٹھہری رہیں۔

''آ ؤ۔ چلی آ ؤ۔ہم فلم دیکھنے جا رہے ہیں۔''

''فلم دیکھنے۔ پاگل ہو گئے ہو کیا۔تمہارے ماں باپ کو پتہ چل گیا۔تو جانتے ہو کیا ہو گا؟''

جمال نے یوں کندھے اچکائے جیسے اسے کوئی پروا نہ ہو۔ثمینہ البتہ زیادہ سہمی ہوئی تھی۔

''بہتر یہی ہے جمال کہ ہم گھر چلیں۔''

''آ ؤ بھئی۔کس بکھیڑے میں پڑ گئی ہو۔ہم بس فلم دیکھنے جا رہے ہیں۔کوئی آسمان تو نہیں گر پڑے گا۔''

پھر وہ چلنے لگا۔ فائزہ اور ثمینہ نے بھی اس کے پیچھے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ تیز تیز چل رہا تھا جیسے اپنی کامیابی پر بہت خوش ہو۔

''یہ کوئی اچھی فلم ہے۔ ہے ناں؟ اچھی نہیں تو پھر یہ مصیبت مول لینے کی کیا ضرورت ہے۔''

''ہاں ۔ دیکھ لینا۔سب لوگ اس کی تعریف کر رہے ہیں۔''

وہ انہیں ایک اطالوی فلم دکھانے لے گیا جس کی اس کے دوستوں نے بے حد تعریف کی تھی۔''بوڑھی عورت کی دولت۔''

تینوں بالکونی کی آخری قطار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ فائزہ اور ثمینہ نے اپنا چہرہ پردے میں چھپایا ہوا تھا۔ اردگرد لوگ اپنے گھر والوں کے ہمراہ بیٹھے تھے۔بعض جوڑے بھی تھے اور بعض مرد اکیلے ہی فلم دیکھنے آئے تھے۔ وہ تینوں ابھی آ کر بیٹھے ہی تھے کہ فلم شروع ہو گئی۔ فائزہ اور ثمینہ جلد ہی فلم میں محو ہو کر اپنی احمقانہ جسارت کو بھول گئیں۔ انہوں نے جذبے اور کرب کے ساتھ ان غریب اطالویوں کی فلم دیکھی جو جوئے اور

مالدار امریکی عورت کے جال میں پھنسے ہوئے تھے۔

فلم ختم ہوئی تو جمال ہوا میں اونچا اڑ رہا تھا۔ ’’واہ، واہ کیا زبردست فلم تھی۔‘‘

’’کتنی خوفناک عورت تھی۔‘‘ ثمینہ نے کہا ’’ان غریب نوجوانوں کو فریب دیتی رہی ہے۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ لاکھوں روپے انہیں مل جائیں گے۔ وہ تو واقعی بلا تھی۔ تمہارا کیا خیال ہے حقیقی زندگی میں ایسی باتیں پیش آ سکتی ہیں؟ ساری فلم کے دوران مجھے تو ہول آ تا رہا ہے۔‘‘

جمال پہلے تو ہنسا۔ پھر خیالوں میں کھو کر کہنے لگا۔

’’میں نہیں سمجھتا کہ ایسی ارب پتی خاتون واقعی کوئی ہو سکتی ہے۔ لیکن اطالوی لوگوں کے مصائب تو حقیقی ہیں۔‘‘

’’جوا۔ وہ تو محض فریب ہے۔‘‘ فائزہ کہنے لگی۔

’’اور فریب کے ذریعے مصائب سے نجات نہیں حاصل ہوتی۔‘‘

جمال بھابھی کے پر اعتماد لہجے سے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

’’کہتے ہیں کہ ارب پتی لالچی بوڑھی عورت امریکہ کی صحیح عکاسی کرتی ہے نہ کہ اس کا مسکراتا ہوا صدر‘‘

’’میرے پلے کچھ نہیں پڑا۔‘‘ ثمینہ نے کہا۔

’’امریکی ڈالر ملکوں پر چھا جاتے ہیں، لیکن ان کا افلاس کم نہیں ہوتا۔‘‘

’’یہ ایک پیچیدہ فلم ہے۔‘‘ اب فائزہ کی باری تھی ’’میں اسے دوبارہ دیکھنا چاہوں گی۔ ایسی اچھی فلم دیکھنا تو ایک تجربہ ہے۔ ہمارا دل فلم دیکھنے کو چاہے تو کوئی رکاوٹ راہ میں نہیں ہونی چاہیے۔‘‘

’’سوٹ کیس‘‘ جمال چلایا۔

فائزہ ہنسنے لگی۔ جمال سوٹ کیس سیٹ پر ہی چھوڑ آیا تھا جس میں حمام میں استعمال ہونے والی اشیا تھیں۔ پھر وہ اسے لینے کے لئے واپس بھاگا۔

’’میرا خیال ہے کہ سوٹ کیس اسے مل جائے گا۔‘‘

’’بھلا ایسی چیزوں سے بھرے ہوئے سوٹ کیس کو لے کر کوئی کیا کرے گا۔‘‘

جمال سوٹ کیس ہاتھ میں لیے بھاگتا ہوا واپس آ گیا۔

MashalBooks.com

''آ ؤاب جلدی کریں۔''

ہنستے ہوئے انہوں نے گھر کی راہ لی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھا رہے تھے ان کے ذہنوں میں فلم کے مختلف حصے گھوم رہے تھے اور وہ ایک دلچسپ فلم دیکھنے اور ایک روایت کو توڑنے کی خوشی سے سرشار تھے۔ فائزہ سوچ رہی تھی کہ وہ کیسے گھر سے اکیلے نکل کر اچھی فلم دیکھنے اور اپنی دوست لیلیٰ کو تلاش کرنے کے قابل ہو سکے گی جسے فلمیں بہت پسند تھیں۔ لیکن وہ ٹکٹ خریدنے کے لیے پیسے کہاں سے لائے گی؟ جمال اپنے آپ پر ناز کر رہا تھا اور جی ہی جی میں جس حد تک ممکن ہو یہی کام دوبارہ کرنے کا عہد کر رہا تھا۔

خوش پوش سکندر انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں پہنے اس اعتماد کے ساتھ چلا آ رہا تھا جو اپنے معیارِ زندگی اور ٹھاٹھ باٹھ پر ناز کرنے والے لوگوں کی خصوصیت ہوتا ہے۔ اس نے بے نیازی سے عورتوں کی طرف دیکھا۔ بسا اوقات اتنی سی بات سے کام بن جاتا ہے۔ گلیوں میں پیدل چلنے والوں سے اسے خاص چڑ تھی۔ کبھی کبھی تو اسے خیال آتا کہ ایسے تمام لوگوں کو جیل کی کال کوٹھریوں میں بند کر دینا چاہیے۔ کہ یہ سب لوگ اگر واقعی چور نہیں ہیں تو بھی چور بن ضرور سکتے ہیں۔ گلی کے نکڑ پر وہ ایک فقیر کے پاس سے گزرا۔ انہیں بھی گلیوں میں مانگنے کی ممانعت ہونی چاہیے۔

''میری مدد کرو۔ خدا کے واسطے میری مدد کرو۔''

خدا کی مدد اسے پہلے ہی حاصل تھی۔ تعریف ہو خدا کی۔ ہاں اسے جو کچھ ملا تھا وہ واقعی اس کا حقدار تھا۔ کم از کم سکندر کو اس بات کا پورا یقین تھا۔

ایک برقع پوش خاتون نے بھکاری کے ہاتھ پر سکہ رکھ دیا۔ وہ اپنی التجا جاری رکھے ہوئے تھا۔ وہ سکے کو فوراً ہی گرفت میں نہ لے سکا کہ اس کے ہاتھ مفلوج تھے۔ سکہ لڑھکتا ہوا ایک سوراخ میں جا گرا۔ اسے دوبارہ حاصل کرنا محال تھا۔ ایک چھڑی وہاں رکھی تھی لیکن بوڑھا فقیر اس کی مدد سے سکے کو سوراخ سے نکال نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے سر کو جھٹکا دینے پر ہی اکتفا کیا اور اپنی صدائیں پھر سے بلند کرنے لگا۔

MashalBooks.com

سکندر ایک خوبصورت عورت کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا جس نے یورپی طرز کا لباس پہن رکھا تھا۔ ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد بالآخر اس نے جملہ کسنے کی جرات کر لی۔ نوجوان عورت سکندر کی بات پر کوئی توجہ دیے بغیر چلتی رہی۔ سکندر نے بھی اپنی راہ لی۔ اپنی دکان کے قریب پہنچ کر اس نے اپنے ہمسایوں سے علیک سلیک کی جنھوں نے گرم جوشی سے اس کے سلام کے جواب دیے۔ اس کی دکان اگرچہ زیادہ بڑی نہ تھی لیکن مال سے بھری ہوئی تھی۔ جب سکندر اندر داخل ہوا تو احمد ہاتھ میں کپڑے کا تھان لیے عقبی کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔ دو عورتیں کاؤنٹر پر جھک کر اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ احمد نے تھان کھول کر دکھایا۔ عورتوں نے کپڑے کو دیکھا اپنے کندھوں پر ڈال کر جانچا اور پھر یوں کھڑی ہو گئیں جیسے تذبذب کی کیفیت سے دوچار ہوں۔

''یہ کپڑا بہت اچھا ہے۔ بہت ہی اچھا۔''

''ہاں مگر اس کا رنگ کچھ ایسا ہی ہے۔''

پہلی عورت نے دوسری عورت کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی اتفاق کیا۔

''تھوڑا سا بے ڈھب ہے۔ ٹھیک ہے ہم اس کے متعلق سوچیں گے۔ کل پھر آئیں گے۔ ایسی ہی کوئی شے تو نہیں خریدنی چاہیے جس پر بعد میں افسوس ہو۔''

احمد انہیں دکھانے کے لیے بہت سے تھان کھول چکا تھا۔ لیکن عورتوں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور روانہ ہو گئیں۔ سکندر اپنا کیش رجسٹر لیے بیٹھا تھا۔

''تمہیں انہیں سوچنے کا وقت نہیں دینا چاہیے تھا۔ خصوصاً اس قیمت پر تو بالکل ہی نہیں۔''

''وہ تو بس تماشا دیکھنے ہی آئی تھیں۔ لگتا ہی نہ تھا کہ خریدیں گی بھی۔ اسی طرح

وہ اپنا وقت گزارتی ہیں۔''

ہاں وہ عورتوں کو خوب سمجھتا تھا۔

''اچھا سیلز مین اس قسم کے گاہک کو کچھ خریدے بغیر جانے نہیں دیتا۔''

''مگر یہ مہینے کے آخری دن ہیں سکندر، اور لوگوں کے پاس ان دنوں پیسے کہاں ہوتے ہیں۔ ہر مہینے یہی چکر ہوتا ہے۔ عورتیں اور مرد سب مہینے کے آخری دنوں میں بس دیکھنے کی خاطر آنکلتے ہیں اور ہم بھی ان کے لیے تھان یونہی کھول دیتے ہیں۔''

''مہینے کا آخر ہو یا نہ ہو تمہارا کام بیچنا ہے۔ کئی بل ادا کرنے والے ہیں۔ تمہیں ذرا مستعدی سے کام لینا چاہیے۔''

احمد تھان سنبھال رہا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ سکندر بلوں میں مصروف ہو گیا۔ پھر احمد کو دیکھتے ہوئے بے ساختہ بولا:

''ابھی میں نے تمہارے بیٹے کو دیکھا تھا۔''

''اچھا۔''

''اب وہ اچھا جوان دکھائی دیتا ہے۔ فلم دیکھ کر باہر آ رہا تھا۔''

احمد نے سکندر کی طرف دیکھا اور اپنا کام بھی جاری رکھا۔ سکندر کے لہجے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی ناگوار بات بھی بتانے والا ہے۔ لیکن کون سی بات؟ احمد واقعی جمال، فلم اور کسی ناگوار بات میں تعلق نہ جوڑ سکا تھا۔ پھر بھی سکندر کے چہرے کے منافقانہ تاثر سے اسے یقین ہو گیا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ وہ اسی وقت دل کش لگتا تھا جب کوئی دکھ دینے والی بات کہنے کے لیے پر تول رہا ہو۔

''ہاں وہ جاتا ہی رہتا ہے۔ نوجوان تو سینما کے دلدادہ ہیں اور وہ- خیر۔ کبھی کبھی وہ زیادہ فلموں کو پسند کرنے لگتا ہے۔''

''اس کے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں۔''

احمد جو کھلے ہوئے بازوؤں کے ساتھ کپڑے کو لپیٹ رہا تھا، یکدم رک گیا۔ پھر بھی اس نے اپنی حیرانی چھپالی۔

''دو عورتوں کے ساتھ؟ عورتیں یا لڑکیاں؟''

''سکول کی لڑکیاں؟''

''عورتیں۔ برقع پوش عورتیں۔''

''اچھا۔''

احمد نے اپنا کام پھر شروع کر دیا۔

''آہ یہ نوجوان۔'' سکندر نے دوبارہ اپنے کھاتوں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور سکندر کا ہاتھ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

''ہیلو۔ اچھا تم ہو۔ ہاں۔ ہاں پہنچ گیا ہے۔''

''کسٹم کا کوئی مسئلہ نہیں ہوا؟ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ ہاں۔ ہاں۔ میں رات تک پہنچ جاؤں گا۔ ٹھیک۔ خدا حافظ۔''

سکندر نے فون رکھ دیا۔

''آہ، اگر ہم نے کچھ نہ کیا تو زندگی دوبھر ہو جائے گی۔ میں سیلز مین بھی نہ رکھ سکوں گا۔''

احمد خاموشی سے اپنا کام کرتا رہا۔ وہ سکندر کو، اس کے کردار کو، اس کے طرزِ عمل کو اور اس کے چھوٹے بڑے معاملات کو اچھی طرح جانتا تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ نوکری اس کے لیے بے روزگاری کے خلاف انشورنس کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نوکری کو قائم رکھنے کی خاطر اس نے ممکنہ حد تک محتاط اور کم گو ہونے کی عادت اپنالی تھی۔ وہ اپنے آپ کو اس طرح پیش کرتا جیسے وہ نہ کچھ دیکھتا ہے نہ سنتا ہے اور نہ ہی کسی کو کوئی بات بتاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں احمد اور سکندر کے درمیان ایک خاص قسم کا ربط استوار ہو گیا تھا۔ مگر اس وقت احمد سکندر کے کاروبار کی بجائے جمال کے متعلق سوچ رہا تھا۔ آخر وہ کس کے ساتھ سینما گیا؟ وہ باپردہ خواتین کون تھیں۔

رات کو جب وہ گھر پہنچا تو عائشہ صحن میں دونوں چھوٹے بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی اور جمال انجیر کے درخت کے نیچے بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی عائشہ سمجھ گئی کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔

''عائشہ تم جاؤ۔ میں نے جمال سے بات کرنی ہے۔''

باپ کے لہجے سے حیران ہو کر جمال اٹھ کھڑا ہوا۔ عائشہ بچوں کو لے کر اور پھر بچوں کو ثمینہ کے سپرد کر کے باپ بیٹے کی باتیں سننے کے لیے دروازے کے پیچھے چھپ گئی۔

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ آج سہ پہر تم کہاں تھے؟''

''آج سہ پہر میں ثمینہ اور فائزہ کو لے کر حمام کو گیا تھا۔''

''اور اس کے بعد؟ - اس کے بعد - میں علی اور سعید کو لے کر فلم دیکھنے گیا تھا۔''

''اچھا تو علی اور سعید اب برقع پہننے لگے ہیں؟''

احمد سیدھا اپنے بیٹے کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

''مجھے معلوم ہے کہ آج سہ پہر تم دو عورتوں کے ساتھ فلم دیکھنے گئے تھے۔ اس لیے جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اچھا تم اب بازاری عورتوں کے ساتھ گھومتے ہو؟ یوں میرے دیے ہوئے پیسے ضائع کرتے ہو؟''

جمال بدحواس ہوا جا رہا تھا۔ تھوڑی سی جھجک کے بعد اس نے اصل معاملہ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔ آخر یہ بات اتنی بھی بری تو نہ تھی۔

''ہاں میں فلم دیکھنے گیا تھا لیکن بازاری عورتوں کے ساتھ نہیں۔ فائزہ اور ثمینہ میرے ساتھ تھیں۔''

عائشہ اب دہلیز میں کھڑی سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی۔ اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

''کیا؟ دوبارہ کہو۔''

''وہ سارا دن گھر کی چار دیواری میں بند رہتی ہیں۔ میں انہیں تھوڑی سی تفریح کروانا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے ہی اصرار کیا۔ یہ کوئی بری بات نہیں۔ آج کل سب لوگ فلمیں دیکھنے جاتے ہیں۔''

احمد نے پورے زور سے اسے تھپڑ رسید کیا۔ جمال لڑکھڑایا اور پھرتن کر کھڑا ہو گیا۔ باپ کے لیے جس قدر بھی احترام اس کے دل میں تھا، اس کی پوری شدت نے جمال کو جواب دینے سے روکا۔ اس نے گستاخ نظروں سے باپ کی طرف دیکھا اور پلٹ کر باہر نکل گیا۔

عائشہ آگے بڑھی۔ وہ بے حد مضطرب تھی۔ پھر وہ صحن کے وسط میں رک گئی۔ لگتا تھا کہ تھپڑ جمال کے بجائے اسے لگا ہے۔

''اس عورت کی وجہ سے باپ اپنے بیٹے کو مارتا ہے۔ آخ۔''

احمد اسے دیکھے بغیر گزر گیا۔ بیٹھک میں جا کر وہ زبردستی یہ بات چھپانے کی کوشش کرنے لگا کہ بیٹے کو مارنے کی وجہ سے وہ خود بھی پریشان ہوا ہے۔ وہ اب بھی ظاہر کر رہا تھا جیسے خاندانی روایت کی خلاف ورزی کرنے پر اسے جمال پر شدید غصہ آ رہا ہے۔

ایک ہی لمحے میں فائزہ کے خلاف عائشہ کی تمام نفرتیں پھر سے زندہ ہوگئیں۔ ابھی وہ گھر آئی ہی تھی کہ تمام جھگڑے پھر سے شروع ہوگئے اور ان کی شدت بھی پہلے سے بڑھ گئی۔ بس وہی ان باتوں کی ذمہ دار ہے۔ ہاں۔ ہارون بھی ہے لیکن وہ یہاں نہیں۔''

ثمینہ نے یہ ساری باتیں سن لی تھیں۔ فائزہ کو اس کی اطلاع دے کر وہ غائب ہوگئی۔ باپ کو آخر اس کا پتہ کیسے چلا؟ عجیب بات ہے۔ کس نے دیکھا تھا انہیں؟ کس نے احمد کو بتایا؟ ان کی پہلی نافرمانی پہلے ہی روز رنگ لے آئی تھی۔ اور جمال جا چکا تھا۔

اس رات کسی نے کھانا نہ کھایا۔ فائزہ اپنے کمرے میں پڑی رہی اور کوئی اسے بلانے کے لیے نہ آیا۔ گھر کے دوسرے حصے سے اسے عائشہ اور ثمینہ کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔ ثمینہ کو اس کی ماں نے مارا تھا۔ احمد نے عائشہ کو کہہ دیا تھا کہ فائزہ کو اس کی حالت اور ہسپتال سے اس کی حالیہ واپسی کے پیش نظر کچھ نہ کہا جائے۔ ویسے بھی احمد کے نزدیک سارا قصور جمال کا تھا اور اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے بیٹے کے ذہن سے ان تمام بغاوتوں کو نکال کر چھوڑے گا۔ ثمینہ اور فائزہ کو اس کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس لیے یہ اس کی ذمہ داری تھی کہ وہ خاندانی روایت کی حفاظت کرے۔ اگر وہ فلم ہی دیکھنا چاہتے تھے تو انہوں نے اجازت کیوں نہ لی؟ آخر وہ سب مل کر بھی تو جا سکتے تھے۔ ہارون اگر فرانس کی بجائے یہیں ہوتا تو وہ اپنی بیوی کو فلم دکھانے لے جا سکتا تھا۔ آہ- وہ میرا بیٹا۔ اس نے شاید اپنا ایمان تو کھو دیا ہے لیکن روایات کا احترام اس کے دل سے ختم نہیں ہوا۔ کیا ہی اچھا بیٹا ہے۔ احمد جوش و خروش سے دعائیں مانگنے لگا۔ ''خدایا ہماری مدد کر۔ اس گھرانے کو پھر سے سکھ چین عطا کر۔ خدایا ہمارے بچے صراط مستقیم پر رہیں۔ بڑائی ہو خدا کی۔ صرف وہی ہارون کو واپس لا سکتا ہے۔ ہمیں اس کی بے حد ضرورت ہے۔ خدا کرے جب اس کے گھر لڑکا پیدا ہو تو وہ خود بھی یہیں موجود ہو اور وہ ہمیشہ ہمارے ساتھ ہی رہے۔''

دعائیں مانگتے مانگتے احمد سجدے میں گر گیا اور کافی دیر تک گہرے خیالوں میں کھو یا رہا۔

ساتھ والے گھر میں پیدا ہونے والے شور وغل سے احمد کے مراقبے میں خلل پڑا۔ ہمسائی کا شوہر یقیناً حسب معمول ایک بار پھر شراب پی کر آیا تھا اور بیوی کو پیٹ رہا تھا۔ ''شراب! خدا ہمیں اس لعنت سے محفوظ رکھے۔'' اور ابھی اس نے بھی اپنے بیٹے کو مارا تھا۔ احمد تشدد اور بیٹوں کی تعلیم کے بارے میں سوچنے لگا۔ لیکن اسے یہ خیال بالکل نہ آیا کہ وہ جا کر جمال سے، فائزہ سے بات کرے اور ان سے پوچھے کہ وہ مستقبل کی تشکیل کس طرح کرنا چاہتے ہیں۔ مستقبل کا تعلق تو آخر ان ہی سے تھا۔ وہ صرف خاندانی نظام کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بچوں کے مستقبل کے متعلق اس کی پختہ رائے یہ تھی کہ اسے صرف ماضی کی ہو بہو توسیع ہونا چاہیے۔ پہلے اس کے باپ نے اس ماضی کی حفاظت کی تھی اور اب وہ خود اس کا محافظ تھا اور جب ہارون واپس آ جائے گا تو وہ یہ ذمہ داری سنبھال لے گا۔

بیئر کے دو جام پینے کے بعد جمال نے تیسرے کا آرڈر دیا۔ یونہی بے مقصد چلتے چلتے وہ راستے میں آنے والے کیفے میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ کچھ دیکھ رہا نہ سن رہا تھا۔ یہاں تک کہ اونچی آواز کے باوجود موسیقی بھی اسے متوجہ نہ کر سکی تھی۔ وہ اپنی تلخی میں گھرا ہوا تھا اور اس بات پر پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ باپ نے محض بھابھی اور بہن کے ساتھ فلم دیکھنے پر اسے تھپڑ مارا ہے۔ اتنی سی بات پر تھپڑ کھانا تو بے حد مضحکہ خیز ہے۔ اس کا ذکر تو وہ اپنے دوستوں سے بھی نہ کر سکتا تھا۔ بیئر کے تیسرے گلاس کو وہ ایک سانس میں چڑھا گیا۔ شراب اور خصوصاً بیئر پینے کی اسے عادت نہ تھی۔ پھر اس نے چوتھے کا آرڈر دیا جیسے وہ اپنے ناگوار موڈ کو بیئر میں ڈبو دینا چاہتا ہو۔

جب وہ باہر نکلا تو اس کی طبیعت بہت اچھی نہ تھی اور اس نے دیکھے بغیر گلی کو پار کیا۔

''ابے او گدھے، ایک طرف ہو کر چلو۔ اسی طرح ہوتے ہیں حادثے۔''

ٹیکسی ڈرائیور نے جمال کو بچا کر رفتار تیز کر دی۔ اس قدر نوجوان اور شرابی۔ کیسا زمانہ آ گیا ہے۔ اب کسی کا احترام تو رہا نہیں۔ بغیر ارادے کے جمال فٹ پاتھ پر ہو گیا اور آتے جاتے لوگوں اور موٹروں کو دیکھنے لگا۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ ایک درخت کا سہارا لیے کھڑا رہا اور پھر خود بخود اس کے قدم گھر کی طرف اٹھنے

لگے۔ تھوڑی دیر بعد اسے اپنی سمت کا احساس ہوا تو واپس جانے کے تصور کو مسترد کرتے ہوئے وہ رک گیا۔ اس کے گھر والوں کو جاننے والی ایک عورت رضیہ نے، جو اس کے گھر سے دس منٹ کے فاصلے پر رہتی تھی، دروازہ بند کرتے ہوئے جمال کو دیکھا اور سمجھ گئی کہ وہ ٹھیک حالت میں نہیں ہے۔

''جمال! کیا بات ہے؟ بیمار ہو یا کسی سے جھگڑا ہوا ہے؟''

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''کیا میں تمہیں گھر پہنچا دوں؟''

''نہیں۔ نہیں میں گھر نہیں جانا چاہتا۔''

''گھر نہیں جانا چاہتے؟ لیکن اس طرح یہاں تو نہیں ٹھہرے رہ سکتے۔ گلی کے وسط میں۔ اچھا گھر نہیں جانا چاہتے تو اندر آ جاؤ۔ یہاں تھوڑی دیر آرام کرلو۔ آ جاؤ۔''

جمال پہلے تو ہچکچایا لیکن پھر اس نے رضیہ کی پیش کش قبول کر لی۔ وہ بچپن سے اسے جانتا تھا۔ رضیہ نے پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔

''وہاں بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارے لیے تیز کافی تیار کرتی ہوں۔ جلد ہی تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

جمال بیٹھ گیا۔ وہ خاموش تھا۔

''تم نے شراب پی ہے؟''

''ارے زیادہ نہیں۔ بس تھوڑی سی بیئر۔''

''بہت سی بیئر جمال۔''

''میں اس کا عادی نہیں ہوں۔''

رضیہ کافی تیار کرنے کی غرض سے باورچی خانے کی طرف چلی گئی اور جمال پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

''لو پیو۔ ابھی طبیعت سنبھل جائے گی۔ گرم گرم پی لو۔''

جمال نے کپ لے کر کافی کا ایک گھونٹ پیا۔

''رضیہ۔ مجھے افسوس ہے۔ میں تمہیں تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن گھر بھی نہیں جانا چاہتا۔ باپ کے ساتھ میرا کچھ جھگڑا ہوا تھا۔''

MashalBooks.com

''باپ کے ساتھ؟ اچھا پھر تم گلیوں میں تو نہیں رہو گے؟''

''میں گھر نہیں جانا چاہتا۔''

''کافی پیو۔''

جمال نے کپ ختم کیا۔ اب اس کی حالت بہتر تھی۔ تیز کافی اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ رضیہ نے ہمدردی سے اسے دیکھا۔ وہ خوبصورت عورت تھی اور جمال کے سامنے بیٹھی تھی۔

''کیا یہ اتنی ہی بری ہے؟'' رضیہ نے نرمی سے پوچھا۔ جمال خاموش رہا۔

''کسی نے تمہیں یہاں آتے نہیں دیکھا۔ تم یہاں رہ سکتے ہو۔ اور کل تک کوئی نہ کوئی بہتری پیدا ہو جائے گی۔''

''اچھا تو میں یہاں رہ سکتا ہوں؟ یہ کوئی زیادتی تو نہیں؟''

''یقیناً نہیں۔ میں خود تمہیں کہہ رہی ہوں۔ اگر تم واقعی گھر نہیں جانا چاہتے تو یہاں رہنا ہی بہتر ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ تم کوئی فضول حرکت کرو۔ ہاں تمہارے والدین کو بہت پریشانی ہوگی۔ تمہارا انہیں خیال کہ......''

''بس میں گھر نہیں جانا چاہتا۔''

''پھر یہیں رہو۔''

''تم بہت مہربان ہو۔''

''چونکہ میں محنت مزدوری کرتی ہوں اس لیے معاملات کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔''

''کیا کرتی ہو تم؟''

''میں وہ سوناٹیکس میں کام کرتی ہوں ناں ٹیکسٹائل فیکٹری میں؟''

''تو یہ کام تمہیں پسند ہے؟''

''اس سے میں اور میرے بچے کسی پر بوجھ بنے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں۔ کام تو یہ مشکل ہے لیکن اس نے مجھے آزادی عطا کی ہے۔''

جمال بچوں کے بیڈروم کی طرف دیکھنے لگا۔ رضیہ اس کی نیت بھانپ گئی۔

''بچے سوئے ہوئے ہیں۔ وہ جلد سو جاتے ہیں۔ میں بھی یہ چاہتی ہوں کہ وہ

اچھی طرح سوئیں تا کہ سکول میں اچھی طرح کام کر سکیں۔تم جانتے ہی ہو کہ ہم غریبوں کے لیے اس مصیبت سے نجات کا واحد راستہ سکول ہی ہے۔ میری سب سے بڑی بچی اب بارہ برس کی ہے۔ وہ میرا ہاتھ بٹاتی ہے لیکن میں اسے تھکانا نہیں چاہتی۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ زندگی میں کامیاب ہو، کچھ سیکھے اور مرضی کی ملازمت کرے۔''

جمال تعریفی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''وہ خوش نصیب ہے کہ اسے تمہارے جیسی ماں ملی ہے۔ میری ماں تو ثمینہ کو سکول بھیجنے کی مخالفت کرتی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ نفیسہ بھی کبھی سکول جا سکے گی۔''

''ہاں وہ غلطی کر رہی ہے۔تم کیا کرتے ہو؟''

''میں ایک مشین بلڈنگ ورکشاپ میں تربیت حاصل کر رہا ہوں۔ یہ بڑا دلچسپ کام ہے۔''

رضیہ ہنسنے لگی۔

''یہ اچھی بات ہے۔''

''آج سہ پہر کو میں حمام جانے کے بعد اپنی بھابھی اور بہن کو فلم دکھانے لے گیا تھا۔ باپ کو اس بات کا نجانے کیسے پتہ چل گیا۔ غصے سے پاگل ہو کر اس نے مجھے تھپڑ مار دیا۔''

رضیہ جمال پر مسکرا دی۔اس کے نزدیک یہ کوئی گمبھیر معاملہ نہیں تھا لیکن وہ جمال کا مزید دل نہیں دکھانا چاہتی تھی۔

''خیر،فکر نہ کرو۔کل تک یہ سب کچھ بھول جائے گا۔ ویسے تم اس وقت بھی گھر جا سکتے ہو۔اب تمہاری حالت بہتر ہے اور یہ کوئی زیادہ بری بات بھی نہیں۔تمہارے والدین بہت پریشان ہو رہے ہوں گے۔''

''نہیں۔نہیں میں گھر نہیں جاؤں گا۔ پھر انہیں اپنی تنگ نظری کا مزہ آئے گا۔''

''خیر، جو تمہاری مرضی۔تم اس پلنگ پر سو سکتے ہو۔البتہ کل تمہیں ہمسایوں کے متعلق محتاط ہونا ہوگا۔ یہاں بہت سی لمبی زبانوں والے رہتے ہیں۔ اس لیے ہمیں انہیں کوئی موقع نہیں دینا چاہیے۔اور ہاں طاؤس کو بھی کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے۔''

رضیہ ہنسنے لگی۔

MashalBooks.com

''رضیہ آخر وہ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ فلم دیکھنے سے ان کی بے عزتی ہوئی ہے؟''

''بے شک اس میں ایسی کوئی بات نہیں ۔لیکن ان کے سوچنے کا انداز ہی ایسا ہے۔اور لوگوں کے طرز فکر کو بدلنا بہت مشکل ہے۔انہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ عورتیں اگر خود فلم دیکھنے چلی جائیں تو ان کی عزت پر کوئی حرف نہیں آتا۔لیکن یہ مشکل کام ہے۔ مرد بھی جب کسی عورت کو تنہا دیکھتے ہیں تو اس پر انگلیاں اٹھاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ اس سے من مانی کر سکتے ہیں۔اسی وجہ سے میں نے بھی فلمیں دیکھنے چھوڑ دی ہیں۔''

''مجھے معلوم ہے کہ میری بھابھی خوش نہیں۔ وہ سخت اداس اور بور ہے اور ماں کو اس کی سمجھ ہی نہیں آتی۔''

''یہ سب کچھ مجھ پر بھی بیتا ہے۔دس برسوں میں میرا شوہر صرف تین بار وطن آیا ہے۔ساس سے میری بنتی نہ تھی۔ پھر اس نے آنا ہی بند کر دیا۔ وہیں اس کا انتقال ہو گیا۔ تین سال گزر گئے ہیں۔آہ وقت کس قدر تیزی سے گزر جاتا ہے۔'' تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

''اس خیال سے مجھے بے حد تکلیف ہوتی ہے کہ وہ وہاں پردیس میں ہی مر گیا۔''

''ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہارون واپس جائے۔لیکن اسے یہاں کوئی کام ہی نہ ملا۔ ویسے بھی میرا خیال ہے کہ وہ یہاں رہنا ہی نہیں چاہتا۔میاں بیوی کو ایک دوسرے سے محبت ہی نہ تھی۔ یہ تو گھر والوں کی طے کی ہوئی شادی تھی۔''

''ایک دوسرے کو جانے بغیر اب ایسی شادیاں نہیں ہونی چاہئیں۔ نہ ہی نوجوان دلہنوں کو ان کے نئے گھروں میں قید کرنا چاہیے۔ یہ سب پرانے زمانے کی باتیں ہیں۔آج کی زندگی کے تقاضے مختلف ہیں۔''

''فائزہ اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتی تھی۔اسے درزی کا کام کرنے، گھر سے باہر آنے جانے، اور برقع کے بغیر گھومنے کی آزادی حاصل کرنے کا شوق تھا۔تم آزاد ہو۔ آزاد۔''

''میں نے اس لیے اپنے سسرال کو چھوڑ دیا تا کہ میں اپنے بچوں اور اپنے کام کے سلسلے میں آزادی حاصل کر سکوں۔ مجھے اس میں کامیابی حاصل ہونے پر خوشی ہے اور

یہ ملازمت ملنے کی بھی۔''

''صاف ظاہر ہے کہ تم خوش ہو۔تم خوبصورت ہو۔''

رضیہ ہنسنے لگی۔انہوں نے اس شوق کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھا جو ایسے شخص سے ملنے پر پیدا ہوتا ہے جس سے گفتگو کرنے میں مزا آئے۔

''ہاں یہ سچ ہے کہ جب آزادی حاصل ہو تو حسن بھی نکھر آتا ہے۔لیکن بعض چیزوں کے متعلق خوشی کے ساتھ ساتھ مجھے بعض باتوں کا رنج بھی ہے۔زندگی کا یہی چلن ہے۔''

کمرے سے ایک بچے کے رونے کی آواز آئی اور وہ بھاگ کر اس کی طرف بڑھی۔ جمال نے بچے کے لیے اسے یوں بھاگتے دیکھا۔ وہ اسے پسند کرتا تھا، جب وہ واپس آئی تو جمال مسکرانے لگا۔

''بس وہ ذرا خواب دیکھ رہا تھا۔ بچے بھی برے خواب دیکھتے ہیں۔ ہم انہیں خوف سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔لیکن ایسا ہوتا نہیں۔''

وہ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ جمال پوری شدت سے اس عورت کی خواہش کرنے لگا جو انسانی ہمدردی سے بھرپور تھا اور جس کی نظریں محبت آمیز اور گہری تھیں۔ رضیہ نے جمال کی کیفیت کو بھانپ لیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''سونے کا وقت ہو گیا ہے جمال۔کل صبح مجھے کام پر جلدی جانا ہے۔دیکھ لینا کل تک حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔''

وہ خاموش ہو گیا۔نشہ ہرن ہو چکا تھا اور چند احساسات باقی تھے۔مہربان اور پرسکون عورت روبرو تھی۔اس عورت کی شدید خواہش کے باوجود وہ خوشگوار محسوس کر رہا تھا۔

اسے یقین تھا کہ رضیہ کے انکار میں حقارت شامل نہیں بلکہ ایسی محبت تھی جو تنہائی کے روگ کی بھینٹ چڑھ چکی تھی۔ یہی سوچتا ہوا وہ سو گیا۔ رضیہ نے اسے سوتے ہوئے دیکھا اور اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔اس نے سوئے ہوئے بچوں پر ایک نظر ڈالی اور دن بھر کے کام اور کھنچاؤ کی تھکاوٹ کے باعث جلد ہی اسے بھی نیند آ گئی۔ چند ہی لمحوں بعد وہ محبت کے خواب دیکھ رہی تھی۔

سورج طلوع ہونے سے پہلے رضیہ نے جمال کو جگا دیا۔ گھر جانے سے پہلے وہ ادھر ادھر ٹہلتا رہا تا کہ اس کا باپ گھر سے روانہ ہو جائے۔ عائشہ دھلے ہوئے کپڑے یوں لٹکا رہی تھی جیسے اس طرح اس کی پریشانی کم ہو جائے گی۔ دروازہ کھلنے کی آواز سب سے پہلے اس نے سنی۔

''جمال کہاں رہے تم؟ میں رات بھر پریشان رہی ہوں۔''

''میں دوستوں کے ساتھ تھا۔''

''رات بھر؟''

''ہاں۔ انہی کے گھر سو گیا تھا۔''

''میں تمہاری چیزیں تیار کر چکی ہوں۔ اچھا جلدی سے ناشتہ کرو اور کام پر جاؤ۔ رات کو باپ سے معافی مانگ لینا۔ اسے خبر نہیں کہ تم گھر نہیں آئے تھے۔''

ناشتہ کیے بغیر جمال نے اپنی چیزیں اٹھائیں اور کام پر روانہ ہو گیا۔

عائشہ نے دھلے ہوئے کپڑوں کی طرف دیکھا اور تھکاوٹ محسوس کرنے لگی۔ اس کی عمر میں نیند کے بغیر کرب کی ایک رات گزارنا سہل نہیں۔ اسے اس بات کا بھی افسوس تھا کہ آج جمال نے جاتے ہوئے اسے پیار نہیں کیا۔ اسے اپنے بازوؤں میں لینے کا عائشہ کا بہت ارمان تھا۔ اسے فائزہ پر ابھی تک غصہ آ رہا تھا جو اس کے نزدیک اس سارے قصے کی ذمہ دار تھی۔ لیکن آج اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ پہلے کی طرح جوش و خروش سے شکایت کر سکے۔ نہ ہی اسے معلوم تھا کہ گھر کے معاملات کو بہتر بنانے کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے۔ یکایک اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اسے معلوم تھا کہ فائزہ باورچی خانے میں ہے اور ابھی کچھ دیر وہیں کام کرتی رہے گی۔

عائشہ نے کپڑے وہیں چھوڑے اور چپکے سے فائزہ اور ہارون کے کمرے میں داخل ہو گئی اور جس قدر دعائیں اسے یاد تھیں، پڑھنے لگی۔ ''بڑائی ہو خدا کی۔ اے رحیم و کریم خدا تو ان بچوں کو راہ راست پر لے آ۔ وہ جوان ہیں اور تیری منشا سے آگاہ نہیں۔ ہاں تو چاہے تو وہ عقل و دانش کی راہ پر چل سکتے ہیں۔ میں تجھ سے التجا کرتی ہوں اس گھر پر اپنی رحمتیں نازل کر اور سکھ چین دے۔ خدایا میری التجا سن لے۔'' پھر وہ کمرے میں دھونی دینے لگی۔

عائشہ نے کمرے کے وسط میں کئی چکر لگائے اور بدروحوں کو بھگانے کے لیے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی رہی۔ کپڑوں کی الماری کھول کر وہاں بھی اس نے پھونکیں ماریں۔ اب اسے یقین تھا کہ بدروحیں بھاگ گئی ہیں۔ لہٰذا سکون اور اعتماد کے ساتھ وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے نکل آئی۔

اب وہ پھر اپنے کام کی طرف لوٹ آئی تھی۔ فائزہ نے اسے صحن میں کپڑے لٹکاتے ہوئے دیکھا۔ عائشہ کو اس قدر پرسکون دیکھ کر اسے تعجب ہوا۔ اسے خدشہ تھا کہ اس سکون کے پیچھے کوئی طوفان امڈ رہا ہے۔ جب وہ اپنے کمرے میں گئی تو دھونی سے اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ فوراً باہر نکل آئی۔ لیکن اب وہ سارے معاملے کو سمجھ گئی تھی اور مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

فیکٹری میں رضیہ سارا دن گذشتہ شام اور جمال کے بارے میں سوچتی رہی۔ جمال نے اس کی خوابیدہ خواہش کو جگا دیا تھا۔ وہ پھر سے جنس کا مزہ چکھنا چاہتی تھی اور یہ بات بالکل فطری بھی تھی۔ وہ بیوہ تھی مگر ابھی اس کے شباب کا عہد ختم نہ ہوا تھا۔ پھر اس نے جنس سے لطف بھی تو بہت کم لیا تھا۔ اس کا خاوند شاذونادر ہی گھر آتا تھا۔ یوں وہ صحبت سے، محبت سے اور جنس سے محروم رہی تھی زندگی تنہائی کے روگ کا شکار تھی اور جس احترام پر وہ مجبور کر دیتی تھی اس لیے جڑیں بھی ان خودساختہ محرومیوں میں پیوست تھیں۔ وہ اپنی تنہائی کو اس لئے بھی برقرار رکھنا چاہتی تھی کہ اسے روایتی زندگی کے جال میں دوبارہ پھنس جانے کا خوف لاحق تھا۔ اسے اس بات کا یقین تھا کہ آج کے زمانے میں روایتی زندگی کی پابندیوں کے نقصانات فوائد سے زیادہ ہیں۔ آخر مرد اور عورت کا رشتہ اس قدر پیچیدہ کیوں ہوگیا ہے؟ آخر فیکٹری میں، بازاروں میں اور مردوں کا رویہ ایسا کیوں ہوتا ہے جس سے صرف جنسی بھوک ٹپکتی ہے؟ رضیہ مختلف انداز سے دن گزارنا چاہتی تھی۔ لیکن یہ کیونکر ہوگا؟ جو احترام اس نے بہت سی مشکلوں کے بعد حاصل کیا تھا۔ اسے کھو دینے سے زندگی اور بھی پیچیدہ ہو جائے گی۔

فائزہ اور ثمینہ بیٹھک کو صاف کر رہی تھیں۔ ثمینہ کچھ پریشان سی تھی اور ذرا سی آواز پر چونک اٹھتی تھی۔

''فائزہ جمال کو سمجھاؤ کہ وہ ابو سے معافی مانگ لے۔ اس نے معافی مانگ لی تو

پھر ہمیں بھی معاف کر دیا جائے گا۔ جمال کل رات گھر واپس نہیں آیا تھا۔ ابو کو پتہ چل گیا تو۔''

''گھر نہیں آیا تھا؟''

''نہیں۔ آج صبح آیا تھا۔''

''خیر یہ کوئی زیادہ بری بات نہیں۔ ان لوگوں نے تو ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے۔ گویا ہم اپنی مرضی سے کسی نگران کے بغیر فلم دیکھنے یا حمام تک بھی نہیں جا سکتے۔''

ثمینہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ وہ خود بچوں کی طرح والدین سے ڈرتی تھی۔ وہ اپنی بالکل نئی خواہشات، فائزہ کی نئی دوستی اور بھائی کی محبت کو بھی قربان نہ کر سکتی تھی۔ ویسے اسے بھائی کے تمام خیالات اور طرزِ عمل کی سمجھ نہ آتی تھی۔ دوسری طرف فائزہ زیادہ خود اعتمادی اور خود آگاہی کے ساتھ عورت بن چکی تھی۔ ہسپتال میں قیام کے بعد وہ پہلے سی فائزہ نہ رہی تھی۔ ثمینہ اور اس کے درمیان فاصلے بڑھ گئے تھے اور ثمینہ ان فاصلوں کی وضاحت نہ کر سکنے کے باوجود انہیں اچھی طرح سمجھتی تھی۔

''ثمینہ زندگی میں، دنیا میں اس سے کہیں زیادہ اہم چیزیں ہیں۔ ہم خواہ مخواہ بغیر کسی مقصد کے ایک دوسرے کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ یونہی خود کو روگ لگا رہے ہیں۔ یہ تو بالکل واہیات بات ہے۔''

ثمینہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر فائزہ خود کو ان خاندانی جھگڑوں سے کس طرح جدا کر سکتی ہے جنھوں نے سب کی زندگی کو ناقابلِ برداشت بنا دیا ہے۔ اس نے قدموں کی چاپ سنی تو فوراً کمرے کے دوسرے حصے کی طرف بھاگ گئی تاکہ ماں ان دونوں کو باتیں کرتے ہوئے نہ دیکھ لے۔ فائزہ سوچنے لگی کہ آخر وہ اس نوجوان نند کو خوف سے نجات کیسے دلائے۔ اس کا بوجھ کیسے ہلکا کرے۔ اسے کس طرح سمجھائے کہ یہ سب باتیں غیر اہم ہیں اور یہ کہ کرنے کو اور بہت کچھ ہے۔ ثمینہ نے باہر دیکھا تو ماں برقع اوڑھ کر باہر جاتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ پھر فائزہ کے پاس آ گئی۔

''ماں ابھی باہر گئی ہے۔''

''اچھا۔ چلو تھوڑا سا کام کر لیں۔''

''اوہو۔ آج نہیں اس سارے واقعے کے بعد تو۔''

''ہاں ۔آج ہی ۔اگر ہم یونہی ٹالتے رہے ثمینہ، تو تم لکھنا پڑھنا کیسے سیکھو گی ۔''

فائزہ اپنے کمرے کی طرف جانے لگی ۔ثمینہ اس کے پیچھے تھی، بیڈ روم میں پہنچتے ہی فائزہ نے ریڈیو آن کر دیا اور اتفاق سے نوجوانوں کا پروگرام نشر ہو رہا تھا۔ فائزہ نے آواز بلند کر دی اور ثمینہ کو ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اسے دھونی کا احساس ہونے لگا۔

''تم نے کمرے میں کیا جلایا تھا؟ اس کی بو تو......''

''میں نے نہیں ۔ یہ کارروائی تمہاری ماں نے کی ہے ۔ یہاں سے وہ بدروحیں بھگا رہی ہو گی ۔''

فائزہ ہنسنے لگی ۔لیکن ثمینہ کی آنکھیں تشویش سے پوری کی پوری کھل گئیں ۔ فائزہ نے اسے ریڈیو سننے کو کہا۔

''ناپسندیدہ شادی سے بچنے کے لیے ایک نوجوان لڑکی سنیہا نے زہریلی دوا کھا کر خودکشی کرنے کی کوشش کی ۔خوش بختی سے اسے بچا لیا گیا اور ہم ہسپتال میں اسے ملنے گئے ۔ وہ پہلے ہی دو بار شادی سے انکار کر چکی تھی ۔ تیسری بار وہ بھاگ گئی ۔لیکن اس کی شادی تو پہلے ہی ہو چکی تھی ۔ اس کے باپ نے اسے کہا، اب تم انکار کر کے خاندان کی عزت کو بٹہ نہیں لگا سکتی ۔'' سنیہا کی داستان انوکھی نہیں ہے ۔ایسے ہزاروں واقعات پیش آتے رہتے ہیں ۔ ہم دفتر میں کام کرنے والی ایک لڑکی کو جانتے ہیں جس نے پانچویں منزل سے چھلانگ لگا دی تھی ۔ ایک اور لڑکی نے اس کار سے باہر چھلانگ لگا دی تھی جس میں اسے مستقبل کے شوہر کے پاس لے جایا جا رہا تھا۔ اب وہ زندگی بھر کے لیے لنگڑی ہو گئی ہے ۔اگر ہم اس قسم کے المناک واقعات کا ذکر کر رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہم رنج والم یا سنسنی کو پسند کرتے ہیں ۔ وجہ بالکل سادہ ہے اور وہ یہ کہ یہ حقیقت ہے ۔اس کا مقصد اشتعال دلانا نہیں بلکہ محض باخبر کرنا ہے تاکہ لوگ یہ جان سکیں کہ رسم ورواج کی غیر لچکدار پیروی ہمیں کس مقام تک لے جا سکتی ہے ۔ ہم تیزی سے بدلتی ہوئی اس دنیا کی مشکلات کا سامنا کرنے والے اپنے نوجوانوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں ۔ ہم یہ سب کچھ اس لیے بھی بتاتے ہیں کہ نوجوان حقائق کا سامنا کرنا سیکھیں ۔ ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھ سکیں چاہے ہمارا تعلق عمر اور معاشرے کے کسی بھی گروہ سے ہو ۔''

اس پروگرام نے فائزہ کے دل میں شوق کی نئی آگ بھڑکا دی ۔ پہلی بار اسی

MashalBooks.com

نے یہ پروگرام سنا تھا اور وہ بھی بالکل اتفاقیہ طور پر اس نے ریڈیو کی آواز بہت اونچی کر دی۔ فائزہ اور ثمینہ دونوں اس قدر توجہ سے پروگرام سن رہی تھیں کہ انہیں عائشہ کے اندر آنے کا پتہ ہی نہ چلا۔ نشر ہونے والی باتوں اور ان دونوں کی ان میں اس قدر توجہ کو دیکھ کر عائشہ کے تو گویا ہوش اڑ گئے۔ دہلیز میں گویا وہ شل ہوگئی اور پھر آپے سے باہر ہو کر اس نے چیختے ہوئے ایک جھٹکے سے ریڈیو بند کر دیا:

''تمہیں ایسی باتیں سننے پر شرم نہیں آتی؟ جھوٹ ہی جھوٹ۔ شرمناک بات ہے یہ۔''

پھر اس نے غصے سے ریڈیو کو فرش پر دے مارا اور ثمینہ کو بازو سے پکڑ کر زور سے کمرے سے باہر دھکیلنے لگی۔

''میں اب کبھی دوبارہ تمہیں اس کمرے میں نہ دیکھوں۔ سنتی ہو ثمینہ؟ کبھی نہیں۔''

اور پھر باہر نکلتے ہوئے اس نے فائزہ کی طرف رخ کیا:

''ہارون کو تمہارے لچھنوں کا علم ہو جائے گا۔ او خدایا او خدایا۔''

فائزہ پہلے تو حیرانی کے عالم میں ششدر سی رہی پھر ایک کشن اٹھا کر اس نے پوری قوت سے اسے دیوار پر دے مارا۔ پھر دوسرا اور تیسرا کشن۔ کشن پھینکنے کے بعد وہ بے چینی سے کمرے میں ادھر ادھر پھرنے لگی۔ لگتا تھا کہ ایسے واقعات پیش کر رہے ہیں جن کو روکنا کسی کے بس میں نہیں اور جو نئے جھگڑوں کا موجب بن رہے ہیں۔ یہ واقعات اس کی مرضی کے بغیر اسے بہائے لئے جا رہے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ پیٹ پر رکھے تو بچہ حرکت کرتا ہوا محسوس ہوا۔ اس بات نے اسے سکون عطا کیا۔ وہ آئینے کے روبرو کھڑی ہو کر اپنا جائزہ لینے لگی۔ اس نے اپنے پھولے ہوئے جسم کو دیکھا اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اپنے بال کھول دے اور وہ یوں لٹک کر دائیں بائیں حرکت کرتے رہیں جیسے وہ ہوا میں سمندر کے کنارے بھاگ رہی ہو۔ اسے اپنی نگاہوں کی شدت کا احساس بھی ہوا۔ تب وہ اپنے عکس پر مسکرا دی اور جواب میں عکس اس پر مسکرانے لگا۔

فائزہ کی واپسی کے بعد ماحول تیزی سے خراب ہو رہا تھا۔ عائشہ کی خوشیاں عارضی ثابت ہوئی تھیں اور اسے یہ حقیقت قبول کرنی پڑی تھی کہ بہو میں پسندیدہ تبدیلیاں تو خیر کیا رونما ہونی تھیں، وہ اب اس کی گرفت سے پہلے سے بھی زیادہ نکل گئی تھی۔ اسے

MashalBooks.com

یقین ہوگیا تھا کہ صرف پختہ عزم کے ذریعے ہی وہ فائزہ جیسی مشکل شخصیت پر قابو پا سکے گی۔ چنانچہ اس نے پابندیوں میں اضافہ کر دیا۔ اس نے ثمینہ کو بہو کے اثرات سے بچانے کے لیے دونوں کے میل جول پر کڑی نظر رکھنی شروع کر دی۔ یوں ثمینہ کی پڑھائی کو جاری رکھنا زیادہ سے زیادہ مشکل ہوتا گیا۔ دوسری طرف ثمینہ کی پڑھنے کی خواہش اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ اس نے ممکنہ حد تک اپنے خوف پر قابو پا لیا اور خود بھی خوش تدبیری سے کام لینے لگی تھی، فائزہ کو اس بات پر حیرت ہوئی اور خوشی بھی۔

پہلے تو عائشہ نے طاؤس سے مدد حاصل کرنے کی بابت سوچا مگر پھر اس خیال سے چپ رہی کہ طاؤس تک کوئی بات پہنچی تو پھر پورے محلے میں پھیل جائے گی۔ اس طرح تو کوئی مسئلہ حل نہ ہوگا۔ ہوسکتا تھا کہ وہ طاؤس کو رازداری برتنے کے لیے کہتی، مگر اس کی عادتوں کو جاننے کی بنا پر عائشہ کو اس کے وعدوں پر یقین نہیں تھا۔

عائشہ کا خیال تھا کہ فائزہ کو مزید بگاڑنے میں اس کی نئی سہیلیوں کا ہاتھ ہے۔ لہٰذا اسی نے ان سے ملنے سے منع کر دیا۔ کم از کم بچے کی پیدائش تک اسے ایسی تمام عورتوں سے دور رکھنا ضروری تھا۔ بعد ازاں، جیسا کہ احمد کا خیال تھا، وہ خود بخود سدھر جائے گی۔ عائشہ بار بار خود سے کہتی کہ بس بچہ پیدا ہونے کی دیر ہے فائزہ بھی دوسری تمام عورتوں کی طرح بچے میں مگن ہو کر رہ جائے گی۔ پھر اس پر نئی ذمہ داریوں کا بوجھ ہوگا۔

ہارون کو تمام باتوں سے آگاہ کرنے کا خیال بھی عائشہ کے ذہن میں آیا، لیکن وہ خود کو ایسا کرنے پر رضامند نہ کر سکی۔ پھر یہ کہ احمد بھی اس بات کے خلاف تھا۔ چنانچہ عائشہ نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔

جیسا کہ ان حالات میں توقع کی جا سکتی ہے، مریم کے لیے گھر کے دروازے بند رہے اور وہ سوچتی رہی کہ فائزہ کی ساس کی نظروں سے بچ کر وہ کس طرح اپنی سہیلی سے مل سکتی ہے۔ یہ بات بالکل واضح تھی کہ وہ اپنی بہو کے نام آنے والے خطوط بھی روک لیتی تھی۔ یہ کام اس نے کمال خاموشی سے کیا تھا۔ لیکن ایک تو وہ خود پڑھنا نہ جانتی تھی اور دوسرے وہ کسی سے خطوط پڑھوانا بھی نہ چاہتی تھی۔ اس لیے اسے قطعاً معلوم نہ ہو سکا کہ یہ خط کس نے لکھے ہیں اور ان میں کیا لکھا ہے۔ جہاں تک فائزہ کے والدین کا تعلق ہے، عائشہ ان سے ہر بات چھپاتی تھی۔ وہ ان کے ہاں جانے کا چرچا تو کرتی، لیکن ہر بار ارادہ

ملتوی ہو جاتا۔ سچی بات یہ ہے کہ دو خط لیلیٰ نے، دو فاطمہ نے اور ایک زہرہ نے لکھا تھا اور ان سب خطوط میں گلہ کیا گیا تھا کہ فائزہ نے وعدے کے باوجود انہیں کچھ نہیں لکھا۔ فائزہ بھی احمق نہ تھی۔ اسے معلوم تھا کہ سہیلیوں نے اسے ضرور خط لکھے ہوں گے۔ خیر وہ انہیں پہلے ہی گھر کے ماحول اور اپنے اوپر ہونے والے ظلم وستم سے آگاہ کر چکی تھی۔ اب اس نے خود خط لکھنے اور انہیں جمال کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ بھی سوچا کہ وہ جمال کو فاطمہ سے براہ راست رابطہ کرنے کے لیے کہے گی۔ اس نے ہارون کو خط لکھنے کی بھی کئی بار کوشش کی۔ لیکن یہ خط کبھی مکمل نہ ہو سکا۔ دراصل اس سے براہ راست مخاطب ہونا مشکل تھا۔ وہ دونوں بہت ہی تھوڑا وقت ایک ساتھ رہے تھے اور وہ مختصر وقت بھی کشیدگی اور مصیبت سے بھرپور تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت ہی کم جانتے تھے اور باہمی محبت کا پودا بھی پروان نہ چڑھا تھا۔ وہ تو ایک دوسرے سے اس قدر مختلف تھے۔

ریڈیو کے جس پروگرام سے گھر میں طوفان برپا ہوا تھا، اس نے دوسرے گھرانوں میں بھی مسائل پیدا کیے تھے۔ جب عائشہ نے ریڈیو کو توڑا تھا تو اس کے چند لمحے بعد ریڈیو کے اعلیٰ افسر کے حکم پر پروگرام روک دیا گیا تھا۔ افسر بھی لوگوں کے احتجاج کے دباؤ میں آ گیا تھا۔ اس نے موسیقی کا پروگرام شروع کرنے کا حکم دیا اور فنی ماہرین نے فوراً اس حکم کی تعمیل کی تھی۔ پروگرام کے پروڈیوسروں نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر ان کی ایک نہ چلی۔ حکام سے ان کی گرما گرم بحثیں ہوئیں۔

''سوری جناب، ہم پر تو یہ الزام لگایا گیا ہے کہ ہم نوجوانوں کو خودکشی کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔''

''نوجوانوں کو اپنی بات کہنے کا حق ہونا چاہیے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ احمقوں کا ذکر شروع کر دیا جائے۔ آخر اور باتیں بھی تو ہیں جن کا ذکر ہو سکتا ہے اور وہ زیادہ اہم بھی ہیں۔''

''یہ تو انتہائی زیادتی ہے۔ آپ نے بہت سے ٹیلی فون موصول ہونے پر پروگرام نہیں رکوایا، بلکہ اس لیے کہ ہم نے عورتوں کو آزادی سے بولنے کی اجازت دے دی اور اس لیے بھی کہ وہ ان موضوعات کا ذکر کرنے لگی تھیں جو ممنوعہ سمجھے جاتے ہیں یا جن کا ذکر صرف اس طرح ہونا چاہیے جس طرح حکومت چاہتی ہے۔ تم وحشت اور درندگی کو

MashalBooks.com

روایت کے نام سے چھپاتے ہو۔ خیر، میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اگر ہم اس کے بارے میں بات نہیں کر سکتے، اس کی مذمت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس کی تائید کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ ہم مکمل طور پر اسے جائز خیال کرتے ہیں۔ اگر ہم اس کا ذکر بھی نہ کریں گے تو پھر عوام کے ذہنوں کو کیسے بدلیں گے؟''

''ہم انہیں یکدم تبدیل نہیں کر سکتے۔ ویسے بھی عورتوں کے مسائل کو دوسرے مسائل سے الگ کر کے تو نہیں دیکھا جا سکتا۔''

''یہی تو ہم کہتے ہیں۔ ہم ان مسائل کو الگ نہیں رکھتے۔''

''دوسرے طریقے بھی ہیں۔''

''لیکن وہ زیادہ موثر دکھائی نہیں دیتے۔ آخر ہم کب تک اپنے نوجوانوں کو خودکشی پر مجبور کرتے رہیں گے؟ بعض اوقات خاموش رہنا بھی جرم ہوتا ہے۔''

''مبالغے سے کام نہ لو۔ ایسی خودکشیوں کو تم انگلیوں پر گن سکتے ہو۔''

''آپ کو معلوم ہی ہے کہ یہ بات درست نہیں۔ پھر اگر خودکشی کرنے والے نوجوانوں کی تعداد کم بھی ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس کا ذکر نہ کریں۔ ہاں آپ سب بزدل ہیں۔''

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس پروگرام کے پروڈیوسر جن میں دو مرد اور دو عورتیں شامل تھیں، زور سے دروازہ بند کرتے ہوئے باہر نکل گئے۔ اپنے تجربات بیان کرنے کے لیے جو نوجوان عورتیں آئی تھیں وہ بھی چلی گئیں اور یوں یہ معاملہ ختم ہو گیا۔

رہی فائزہ تو اس کے پاس اب ریڈیو رہا ہی نہ تھا اور یہ بات اس کے لیے تکلیف دہ تھی۔ جمال نے پیش کش کی کہ وہ باہر جاتے ہوئے اسے اپنا ریڈیو دے جایا کرے گا، لیکن فائزہ نہ مانی۔ اسے ڈر تھا کہ اس ریڈیو کا حشر بھی وہی ہو گا۔

احمد اس خاندانی جھگڑے کا خاموش تماشائی بنا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ عورتوں کے معاملے میں اسے ٹانگ نہیں اڑانی چاہیے۔ پھر بھی اس کی حیثیت موثر اور یقینی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ بچہ پیدا ہونے کی دیر ہے الجھنیں خود بخود سلجھ جائیں گی اور اگر کوئی نازک صورت حال پیدا ہوئی تو وہ ہارون کو لکھے گا تاکہ اپنی حیثیت میں اس کی حیثیت کا اضافہ بھی کر سکے۔ اسے یقین تھا کہ جمال اب ویسی غلطی نہ دہرائے گا اب وہ زیادہ تر

ثمینہ کے مستقبل کے متعلق سوچتا رہتا۔ ثمینہ کی شادی ہونی ہے اور جمال کی بھی۔ جلد ہی اسے ان دونوں کے بارے میں فیصلے کرنے ہوں گے۔ نئی نسل پرانی کے مقابلے میں زیادہ تیز اور خود مختار ہے۔ اس لیے والدین کو احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ ٹھیک ہے جب وہ وقت آئے گا تو وہ اپنی بیوی سے بات بھی کر لے گا۔

جمال کی وساطت سے فائزہ نے اپنی سہیلیوں کو خطوط لکھے اور فاطمہ اور جمال کے ذریعے ان کے جواب بھی آ گئے۔ ان دونوں کی عمر اور زیادہ آزادی کی بنا پر ملاقاتیں آسان ہو گئیں۔ وہ جب آپس میں ملے تو جلد ہی دوست بن گئے۔ دونوں نئی زندگی اور آزادی کے آرزومند تھے۔

فائزہ کو کتابوں اور اخباروں کی کمی نہ تھی۔ کمی بس آزادی کی تھی۔ وہ روزمرہ کی زندگی سے سمجھوتہ نہ کر سکی تھی۔ اس لیے یہ احساس بڑھتا گیا وہ چار دیواری میں قید ہو کر رہ گئی ہے۔ نجات کی راہ ایک ہی تھی کہ وہ کسی طرح فرانس چلی جائے اور ہارون کے ساتھ رہنے لگے۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ اس کے ساتھ رہنے کی خواہش مند تھی۔ بات صرف یہ تھی کہ وہ ہارون کی بیوی تھی اور بچہ بھی پیدا ہونے والا تھا۔ یہ بھی تھا کہ فرانس جانے کا مطلب اس قید سے نکلنا تھا اور تمام آرزوؤں اور آزادی کے خوابوں کا تعلق یہاں سے کسی نہ کسی طور نکلنے سے تھا۔ وہ ہر قیمت پر سسرال سے، بوسیدہ روایت کے ناگوار بوجھ سے، نجات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ خیر، ہارون کے پاس جانا بغاوت کے مترادف نہ تھا۔ تاہم یہ قدم اٹھانے کے لیے بھی اسے ہارون کو لکھنا ہوگا۔

جب بھی فائزہ اپنے کمرے میں اکیلی ہوتی وہ اپنے شوہر کو خط لکھنے کی کوشش کرتی لیکن اس ناکام کوشش کا خاتمہ لیلیٰ کو خط لکھنے یا فاطمہ اور زہرہ کو جواب دینے پر ہوتا۔

زہرہ کی حالت سنبھل رہی تھی۔ چند ماہ میں وہ صحت یاب ہونے والی تھی۔ یہ درست ہے کہ وہ دوبارہ فیکٹری میں اپنے کام پر واپس جانے کے قابل نہ ہوگی اور اسے تشویش بھی اسی بات کی تھی۔ تاہم اسے اس بات کی خوشی تھی کہ اس نے اپنی جرات، اپنی پرسکون توانائی اور اپنی زندگی کو متعین کرنے کی روزمرہ کی اہلیت دوبارہ حاصل کر لی ہے۔ فائزہ اسے پسند کرتی تھی۔ لیلیٰ کو بھی وہ چاہتی تھی۔ اسے بارہا وہ دن یاد آتا جب اس نے اپنی دوست سے کہا تھا:

''تم بڑی خوش نصیب ہو لیلیٰ۔ تمہارے پاس ایک اچھی ملازمت ہے۔ اور تم اسے پسند بھی کرتی ہو۔''

''ہاں میں یہی کچھ چاہتی تھی۔ لیکن تم جانو ڈگمگانے کا ایک لمحہ ضرور ہوتا ہے جب ہمیں یہ علم نہیں رہتا کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ کیا کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں۔ ہم واقعی کیا چاہتے ہیں۔ ہم کون ہیں۔ زندگی سے ہمارا تقاضا کیا ہے۔ لیکن دوسرے ہی روز میں اپنی شاگردوں کو دیکھتی ہوں۔ ان کی نظریں مجھ سے اور مستقبل سے سب کچھ حاصل کرنے کا تقاضا کرتی ہیں۔ اور میں پھر اپنے کام میں جت جاتی ہوں۔''

فائزہ کو یاد تھا کہ یہ سب کچھ کہنے کے بعد لیلیٰ ہنسنے لگی تھی۔

سہیلیوں سے دوبارہ ملنے، ان سے باتیں کرنے اور ان سے مشورہ لینے کی فائزہ کی خواہش روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے پاس تو ایسی شاگرد بھی نہ تھیں جن سے وہ ڈگمگانے کے لمحے کے بعد مل سکتی۔ تاہم اسے یقین تھا کہ ہر شخص اپنا مستقبل خود بنا سکتا ہے۔ شرط بس یہ ہے کہ پوری قوت سے کام لیا جائے۔ لیکن ہارون کو خط ابھی تک نہیں لکھا جا سکتا تھا۔ جونہی وہ قلم اٹھاتی خوابوں میں کھو جاتی۔ وقت یونہی گزر جاتا۔

ایک روز اس نے بغیر رکے خط مکمل کر ہی لیا اور اس خدشے سے اسے دوبارہ نہ پڑھا کہ کہیں وہ اسے ایک بار پھر پھاڑ نہ دے۔

فائزہ نے خط خود پوسٹ کرنے کا ارادہ کیا اور برقع پہن کر جانے لگی۔ اچانک عائشہ سامنے آ گئی۔

''تم کہاں جا رہی ہو؟''

''ذرا سیر کے لیے باہر جا رہی ہوں۔ صحن کے اندر دائروں میں گھومتے گھومتے تنگ آ گئی ہوں۔''

''باہر جانے کی پڑی ہے باہر جانے کی۔ تم اکیلے باہر نہیں جا سکتیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔''

''ہاں ماضی میں تو شاید ایسا کبھی نہیں ہوا۔ لیکن آج کل یہ سب کچھ چلتا ہے۔''

''تم اکیلی نہیں جاؤ گی فائزہ۔ میں تمہارے ساتھ جا رہی ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے عائشہ دروازے اور فائزہ کے درمیان حائل ہو گئی۔

''ثمینہ، لانا میرا برقع۔''

وہ راستہ روکے کھڑی تھی اور فائزہ انتظار کر رہی تھی۔ ثمینہ برقع لائی تو عائشہ اسے اوڑھ کر باہر نکل گئی۔ فائزہ اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ ثمینہ انہیں جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ اس نے بچوں کو بھی روک رکھا تھا جو ماں کے پیچھے بھاگنے کے لئے بے تاب تھے۔

وہ زیادہ دیر باہر نہ رہیں۔ عائشہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دو تین چیزیں بھی خرید لیں۔ پھر وہ کچھ کہے سنے بغیر گھر واپس آ گئیں۔ فائزہ خط پوسٹ نہ کر سکی۔

اس رات جمال فائزہ کے لیے اخبار لے کر آیا تو اس نے اس سے خط پوسٹ کر دینے کی درخواست کی۔

''اچھا تو آخر تم نے لکھ ہی لیا''

''ہاں''

''بہت خوب۔ میں ضرور اسے پوسٹ کروں گا۔ وعدہ رہا''

جمال فائزہ پر مسکرا دیا اور جاتے ہوئے اس نے آنکھ سے اشارہ بھی دیا۔ بھائی کے لیے لکھا گیا خط اس کی جیب میں حفاظت سے تھا۔

خط پوسٹ ہونے کے بعد فائزہ جواب کا انتظار کرنے لگی۔

بچہ زیادہ قوی ہوتا جا رہا تھا۔ فائزہ اس کی حرکات کو زیادہ شدت سے محسوس کرنے لگی تھی۔ رات کی گہری تنہائیوں میں وہ اسے سنتی۔ اپنے پیٹ کو پیار کرتی اور آنے والے دنوں کے سپنوں میں کھو جاتی۔ بچے کے لیے، زندگی کے لیے اس محبت سے اسے چین مل گیا تھا۔

فرانس میں ہارون کو پرانی نوکری دوبارہ مل گئی تھی۔ لیکن بڑھتے ہوئے معاشی بحران کی بنا پر تضادات ابھرنے لگے تھے اور نسل پرستی کا رجحان بڑھ گیا تھا۔ شہر کی دیواروں پر تارک الوطن محنت کشوں، غیر ملکیوں، عربوں اور افریقیوں کے خلاف جا بجا نعرے لکھے تھے۔ شاید ہی کوئی دن تیل کے چرچے کے بغیر گزرتا۔ گویا بین القومیتی کارپوریشنوں اور تیل کے بادشاہوں کی دولت مزدوروں میں تقسیم کی جانے والی ہو۔ اسی طرح بے روزگاری کا چرچا بھی ہر وقت رہتا اور غیر ملکی محنت کشوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا۔ اس 'لمبی چوڑی' امداد کا ذکر بھی رہتا جو فرانس حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے

تقسیم کرتا تھا اور جس کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ ''ملکی صنعت کو سہارا دے گی۔'' حالات ناقابل برداشت ہوتے جارہے تھے۔

ٹیلی ویژن پر چند ایک سرکاری بیانات جاری کیے گئے۔ جو لوگ آگ بھڑکانے کے ذمہ دار تھے وہی اب یہ بتانے لگے تھے کہ معاملات اس قدر سادہ نہیں ہیں اور یہ کہ آزاد سرمایہ دارانہ معیشت کو غیر ملکی مزدوروں کے خون کی طلب ہوتی ہے۔ ایک مزدور سگریٹ خریدنے کے لیے جاتا ہوا مارا گیا کیونکہ وہ بظاہر عرب دکھائی دیتا تھا۔ ایک اور کو ناچ گھر سے نکلتے ہوئے قتل کر دیا گیا۔ ایک اور...... حکام کے نزدیک اس قسم کے واقعات شاذ و نادر ہی ہوتے تھے اور معزز شہریوں نے غیر ملکی محنت کشوں کے گھروں کو نذر آتش کرنے اور ایسے ہی دیگر شرمناک واقعات سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ غیر ملکی محنت کشوں کو معلوم تھا کہ اس المیے کی شدت کو بڑھنے سے روکنے کے لیے انہیں بے حد محتاط رہنا ہوگا۔

کابینہ نے ایک مسودہ قانون منظور کیا جسے اب فرانس کی قومی اسمبلی میں پیش کیا جا رہا تھا۔ اس مسودے میں غیر ملکی مزدوروں کو بڑی تعداد میں واپس بھیجنے کی سفارش کی گئی تھی۔ دو تین لاکھ مزدوروں کو ہر سال واپس بھیجنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ سرکاری طور پر انکار کے باوجود غیر ملکی محنت کشوں کو ایک ایسی معاشی صورتحال کے لیے قربانی کا بکرا بنایا جا رہا تھا جس کے پیدا ہونے میں ان کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ انہوں نے اپنے خون پسینے سے فرانس کی ترقی اور خوشحالی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ مگر خود انہیں تمام حقوق سے محروم رکھا گیا تھا۔ قومی اسمبلی میں مخالفانہ آوازیں اٹھنے لگیں:

''غیر ملکی مزدوروں کے احترام ہی سے انسانی حقوق کے احترام کا آغاز ہوتا ہے۔''

''یہ مسودہ غیر ملکیوں سے نفرت پر مبنی ہے۔''

''یہ تارک وطن لوگوں کے خلاف ہے۔''

''مزدوروں پر ستم ڈھایا جا رہا ہے۔''

''فرانس کو اخراج کی سرزمین بنا دیا گیا ہے۔''

سڑکوں پر اور اخباروں میں تھوڑا بہت احتجاج بھی ہوا۔ لیکن رائے عامہ کو ہموار کیے بغیر اس احتجاج سے بل کی منظوری کی راہ نہ رک سکی۔ پارلیمانی اکثریت سے بل کو منظور کر لیا گیا۔ ایک حکم کے ذریعے فرانس میں غیر ملکیوں کے قیام اور ملازمت کی شرائط

MashalBooks.com

طے کی جاتی تھیں۔ اس کے تحت کام کی عدم موجودگی کی صورت میں کام کرنے کی اجازت اور قیام کا پرمٹ دونوں فوری طور پر منسوخ ہو سکتے تھے۔ کساد بازاری کے اس زمانے میں ہر ماہ ایک ہزار کمپنیاں اپنے دروازے بند کر رہی تھیں۔ اس صورت حال میں خدشہ تھا کہ فرانسیسی مزدور بے روزگاری کے عفریت سے خوف زدہ ہو کر ان غیر ملکی محنت کشوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے جو کمزور ترین ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کا پہلا نشانہ بنتے ہیں جو اپنے مفادات اور بالادستی کو برقرار رکھنے کی خاطر نہ صرف فرانس بلکہ ہر جگہ لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف اکساتے ہیں۔

یہ تھی وہ دنیا جس میں ہارون واپس آیا تھا اور جو پہلے سے بھی زیادہ مشکل اور سخت ہو گئی تھی۔ اس نے زیادہ حساس اور تیز نقطہ نظر کے ساتھ پیرس کو دوبارہ دریافت کیا۔ اس نے اس عظیم شہر کی پراسراریت اور سحر انگیزی کو بھی دیکھا۔ پیرس اس کو ایسا تاثر دیتا تھا گویا بیک وقت دو مختلف زندگیاں بسر کرنا ممکن ہو۔ دور اپنے دیس میں اب وہ شادی شدہ تھا اور جلد ہی باپ بننے والا بھی تھا۔ وہیں اپنے دیس میں اس کے والدین، اس کے بھائی، اس کی بہنیں اور اس کی بیوی تھی۔ لیکن یہاں ایک لحاظ سے وہ تنہا تھا، آزاد تھا۔ یہاں وہ اپنے حالات کو بہتر بنانے کی امید کر سکتا تھا۔ موجودہ صورت حال میں تو یہ بات پہلے سے بھی زیادہ قریب تھی پھر بھی اگر خواب نہ دیکھے جائیں تو بھی وہ وقتاً فوقتاً بہتری کی توقع کر سکتا تھا چاہے اس کا تعلق موجودہ مشکلات اور بے روزگاری اور وطن واپس بھیجے جانے کے خدشے کے کم ہونے سے ہی ہو۔ پھر یہاں کسی روز، اچانک کسی موڑ پر کسی عورت کا سامنا ہو جانے کی امید بھی تھی۔ یہ وہ آس ہے جو اس وقت تک ختم نہیں ہوتی جب تک بھرپور اور پرتسکین زندگی میسر نہ آ جائے۔ وطن میں قیام اور خصوصاً شادی کے بعد سے اسے عورت کی موجودگی کی عادت سی ہو گئی تھی۔ لیکن وہ فائزہ کو اپنے پاس دیکھنے کا آرزومند نہ تھا۔

ایک شام وہ دو عورتوں سے ملا۔ ان میں سے ایک کو وہ جانتا تھا۔ گزشتہ برس اس نے ایک شب اس کے ساتھ گزاری تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کا حال پوچھا۔ وہ ہنس پڑی۔ یاد اسے بھی سب کچھ تھا۔ لیکن لگتا تھا کہ اس وقت وہ جلدی میں ہے۔

''کیسے ہو؟''

''ٹھیک ہوں اور تم؟''

''عرصے کے بعد تمہیں دیکھا ہے۔'' وہ دوبارہ مسکرائی۔

''معاف کرنا۔''

اس نے سردمہری سے ہارون کو خدا حافظ کہا اور پھر اپنی دوست کے ساتھ جا ملی۔ وہ اس عورت کو پسند کرتا تھا لیکن لگتا تھا کہ اب وہ اس سے کوئی تعلق رکھنے کی روادار نہیں۔ حالانکہ ان کا تعلق بہت اچھا رہا تھا۔ ایک دوسرے کے ساتھ انہوں نے کوئی لیت و لعل نہ کی تھی۔ وہ طوائف نہ تھی۔ اس نے پیسے بھی نہیں مانگے تھے۔ ہارون اپنے خیالات میں کھو گیا۔ کتنی بری بات ہے۔ چند لمحوں کے لیے اسے فائزہ کا خیال آیا مگر پھر اس نے اسے ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ اپنی دنیاؤں کو الگ رکھنا چاہتا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے بہت مختلف تھیں۔ ہر ایک میں وہ الگ الگ جیتا تھا۔

ہارون کنسٹرکشن سائٹ پر نہیں رہتا تھا بلکہ تارکین وطن کے ایک ہوٹل کے ایک کمرے میں چار دوستوں کے ساتھ مل کر رہتا تھا جو گزرے وقتوں کی نشانی کے طور پر ابھی تک قائم تھا۔ کبھی کبھی وہ اور اس کے دوست نئے تعمیر ہونے والے بڑے گھروں میں رہنے کے خواب دیکھا کرتے تھے جو انہوں نے خود تعمیر کیے تھے۔ انہیں اندر جانے کی راہ دینے کے لیے دروازے خود بخود کھل جائیں گے۔ ہال میں پودے رکھے ہوں گے۔ یہ ایسا گھر ہوگا جس میں بیٹھنے کا ایک بڑا کمرہ اور ایک بالکونی بھی ہوگی۔ چاروں طرف وہ پردے لٹکا دیں گے اور وہاں ایک عورت چلی آئے گی کیونکہ وہاں آنا اس کے لیے سہل ہو گا۔ سمندر کی طرح نیلگوں باتھ روم ہوں گے۔ ایک روز انہوں نے مل کر بہت سے ایجنٹوں سے رابطہ قائم کیا لیکن کوئی دو تارک وطن مزدوروں کو ایک کمرہ بھی کرائے پر دینے کو تیار نہ تھا۔ اپنے گھروں میں جن کی بنیاد ان کے خون پسینے پر رکھی گئی تھی۔ عرب اور افریقی طلبہ کے لیے تو ٹھیک ہے۔ لیکن کنسٹرکشن سائٹ پر محنت کرنے والے مزدوروں کو نہیں۔ ویسے بھی احمقانہ خیال ہی تھا۔ اتنا زیادہ کرایہ ادا کرنا، زندہ رہنا، گھر پیسے بھیجنا اور آزادی کے خوابوں کو پالنے کے لیے کچھ بچت کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔

ہارون کو ابھی گھر سے ایک خط موصول ہوا تھا اور دوپہر کے کھانے کے وقفے کے دوران وہ کریم کو ڈھونڈتا رہا۔ کریم ایک نوجوان مزدور تھا جو فرانسیسی اور عربی میں لکھ پڑھ سکتا تھا اور جس کے ساتھ ہارون کی خوب بنتی تھی۔ کریم مزدوروں کے ایک گروہ کے ساتھ باتیں کررہا تھا لیکن جونہی اس نے ہارون کو دیکھا تو وہ اس کے قریب آ گیا۔

''یہ خط آیا ہے۔ کیا مجھے پڑھ کر سناؤ گے؟''

''یقیناً''

وہ دوسروں سے الگ ہو کر بیٹھ گئے جو ابھی تک اپنے کام، معاوضے اور اپنے خدشوں پر باتیں کررہے تھے۔

''ہارون، میرے شوہر!''

ہارون چونکا۔ فائزہ کا خط۔

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں سخت بیمار ہوگئی تھی اور مجھے ہسپتال لے جایا گیا تھا اور یہ کہ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ بچہ ضائع ہونے کا اندیشہ ہے تاہم جہاں تک بچے کا تعلق ہے اب سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ میں خود بھی ٹھیک ہوں تاہم ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ماں اور بچہ دونوں کے لیے نفرت اور بے چینی مناسب نہیں۔ تم جانتے ہی ہو کہ میں یہاں خوش نہیں ہوں۔ شاید اسی لیے میں بیمار ہوئی تھی۔ بس اس طرح نہیں جی سکتی۔ میں بے حد اداس ہوں اور یہاں پیرس میں آ کر تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ تم آخر صرف اپنے والدین ہی کو خط کیوں لکھتے ہو؟''

اس نے شدید غصے اور حیرانی کے عالم میں خط کریم کے ہاتھوں سے چھین لیا۔ اس نے ہارون کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں نیچی کرلیں۔ ہارون خط کو مروڑ رہا تھا لیکن

MashalBooks.com

پھر اس نے اپنا ارادہ بدل لیا اور خط دوبارہ کریم کی طرف بڑھا دیا تا کہ وہ اسے پڑھ کر سنائے۔

''مجھے جلد جواب دو ہارون۔ مجھے امید ہے کہ تم تندرست ہو گے۔ یہاں سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔تمہاری بیوی، فائزہ۔''

غصے سے ہارون نے خط دوبارہ لے لیا۔

''تم ناراض لگتے ہو۔آخر کیوں؟ وہ تمہاری بیوی ہے۔''

''اسے میرے والدین سے پوچھے بغیر مجھے خط نہیں لکھنا چاہیے تھا۔اسے مجھے حکم دینے کا حق بھی نہیں۔''

''وہ تمہیں کوئی حکم نہیں دے رہی۔بس تم پر اعتماد کر رہی ہے۔اس میں حرج ہی کیا ہے؟''

ہارون نے پریشانی میں سگریٹ پینا شروع کر دیا۔

''اچھا تو اس نے میرا پتہ کس سے لیا۔ میں تو منع کر چکا تھا یہ ضرور جمال کی شرارت ہو گی نوجوانوں کے دل میں جو آتا ہے کر گزرتے ہیں۔ میں اسے جواب دوں گا۔پھر ہم دیکھیں گے۔''

''مجھے تو تمہاری سمجھ نہیں آتی ہارون۔یہ خط تو اس کی محبت کا ثبوت ہے۔''

''وہ یہاں بھی پہنچ سکتی ہے۔تم اسے نہیں جانتے۔ یہاں ہماری حالت سے تم واقف ہی ہو۔تم جانتے ہو میں کہاں رہتا ہوں۔ میں اسے پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ ایک مزدور کی بیوی کے لیے فرانس کوئی مثالی جگہ نہیں ہے۔وہ وہیں ٹھیک ہے اس سے زیادہ وہ کیا چاہتی ہے۔اسے کسی شے کی کمی نہیں۔''

''لیکن وہ تم سے دور ہے۔شادی کا مطلب تو مل کر رہنا ہوتا ہے۔سمجھے؟ شادی سے مراد سسرال کے ساتھ اکیلے رہنا نہیں۔''

''وہ اکیلی نہیں۔ یہاں اس حالت میں میں فرانس میں برسوں اکیلا رہا ہوں۔ پھر آج کی صورت حال کو بھی تم جانتے ہو۔کسی وقت بھی روزگار ہم سے چھن سکتا ہے اور ہمیں واپس بھیجا جا سکتا ہے۔ میں پہلے ہی اسے بلانا نہیں چاہتا تھا اور اب تو حالات اور بھی خراب ہو گئے ہیں۔خیر تم وہی لکھو جو میں لکھواتا ہوں ورنہ انکار کر دو۔''

کریم نے اس کی طرف دیکھا اور وہ سمجھ گیا کہ وہ اسے اپنا ارادہ نہ بدلنے دے گا۔

''پیارے امی، ابو!''

''مجھے ابھی فائزہ کا خط ملا ہے۔ تم میری طرف سے اسے بتا دو کہ میں خوب جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور یہ کہ اسے مجھے ہدایات جاری کرنے کا کوئی حق نہیں۔''

وہ ایک پل کے لیے رکا۔ کریم اسے دیکھنے لگا۔

''اچھا تو تم اسے یہ لکھواؤ گے؟''

''بالکل۔''

ہارون پھر سے لکھوانے لگا اور کریم نہ چاہتے ہوئے بھی لکھتا گیا۔ ہارون نے اسے فائزہ کی وہ تصویر ایک بار دکھائی تھی جو اس نے ہارون کی قمیض میں رکھ دی تھی۔ کریم کا خیال تھا کہ وہ خوبصورت، پسندیدہ اور پرکشش ہے اور اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر سوال کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ خود وطن کی کسی عورت کو پاس رکھنے پر مطمئن ہوتا کیونکہ فرانسیسی عورتوں کے ساتھ اس کی مہمات نجانے کیوں ہمیشہ ناکام ہوتی تھیں۔

ہارون نے یہ خط خود پوسٹ کیا۔ فائزہ کا خط ملنے پر اسے اس قدر غصہ آیا تھا کہ اس نے شادی کی تصویر بھی پھاڑ دی تھی۔ اب وہ اس پر افسوس کر رہا تھا۔ تصویر تو نہیں پھاڑنی چاہیے تھی۔ اب غصہ اتر جانے، اور شدید ردعمل ختم ہونے کے بعد وہ بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ گھر کی اور یہاں کی زندگیاں ایک دوسرے پر اثر انداز نہ ہوں لیکن اس کی کوششوں کے باوجود یہ مداخلت شروع ہو گئی تھی اور اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ فائزہ صرف وہی کرتی ہے جو اس کے جی میں آتا ہے۔

وہ ہوٹل کے نیچے کیفے میں بیٹھ گیا۔ اس نے کچھ کھایا نہیں تھا لیکن بھوک بھی نہ لگ رہی تھی۔ مزدور حسب معمول جوش وخروش سے تاش اور ڈامی نوز کھیل رہے تھے۔ بار کے پچھلے حصے میں وہ اکیلا بیٹھا بیئر اور سگریٹوں سے دل بہلاتا رہا۔ سگریٹ پر سگریٹ پیتے ہوئے اس نے فائزہ کے بارے میں اس سے زیادہ غور کیا جتنا کہ وہ پسند کرتا۔ خط۔ والدین۔ فائزہ کی نظریں اس کی سوچوں میں گھومنے لگیں۔ ورک سائٹ پر اسے اپنے نوجوان دوست کی نظریں بھی یاد تھیں۔

چند موسیقار کیفے میں داخل ہوئے تو تالیاں بجا کر جوش وخروش سے ان کا

استقبال کیا گیا۔ اپنے اپنے پسندیدہ نغموں کی فرمائش کرتے ہوئے لوگوں نے ان کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ موسیقاروں نے خوشی خوشی اپنے ساز بجائے شہنائی اور بانسری۔ جیسے اس کی شادی پر بجائی گئی تھی۔ کئی لوگ رقص کرنے لگے۔ وہ محمود نے اس کی شادی پر کیسے رقص کیا تھا۔

کمرے کے ایک اور کونے میں ایک اور تنہا آدمی بیئر پی رہا تھا۔ وہ گرد و پیش کے لوگوں کے خوش گوار موڈ سے بالکل بے نیاز دکھائی دیتا تھا۔ ہارون نے اسے دیکھا تو یوں لگا جیسے وہ اپنے آپ ہی کو دیکھ رہا ہو۔ تنہا اور بیئر کا گلاس۔ لہٰذا وہ اٹھا اور اوپر جا کر بستر میں لیٹ گیا۔ کیفے میں لوگ اب بھی نغمے سن رہے اور ناچ رہے تھے۔

دوسرے روز ہارون اس احساس کے ساتھ جاگا کہ ہفتے کی چھٹی اس خط کی وجہ سے برباد ہو جائے گی۔ خط ابھی تک ذہن پر سوار تھا۔ ناگوار موڈ کی بنا پر اس نے اکیلا رہنا ہی بہتر خیال کیا اور سیر کے لیے باہر نکل گیا۔ ایک سینما کے باہر وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا لیکن فلمیں چاہے مصری ہوں یا عریاں اسے پسند نہ تھیں اس لیے وہ آگے بڑھ گیا۔ ایک دکان کے سامنے اس نے ایک عرب نژاد عورت کو کھڑے دیکھا۔ عورت اسے اچھی لگی تو وہ آگے بڑھ کر اس سے کچھ کہنے لگا۔ لیکن وہ عورت ہاتھ آنے والی نہ تھی۔ ہارون کو دیکھ کر وہ چپکے سے کھسک گئی۔ ہارون اسے جاتی ہوئے دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں ایک کار آ کر اس کے قریب رکی اور وہ ڈرائیور کی توجہ ہارون کی طرف دلاتے ہوئے اس میں بیٹھ گئی۔ کیا وہ اس کا شوہر ہے؟ دوست ہے؟ ہارون تیزی سے آگے بڑھتا گیا اور پہلی گلی میں مڑ گیا۔ اس کی توہین کرنے کی خاطر ڈرائیور نے موٹر تیز کی۔ لیکن خوش قسمتی سے اس گلی میں دوطرفہ ٹریفک کی اجازت نہ تھی۔ اس لیے وہ ہارون کے پیچھے نہ آ سکا۔

اس واقعہ سے رنجیدہ ہو کر ہارون نے کیفے کا رخ کیا اور بیئر کا آرڈر دے کر سگریٹ پینے لگا۔ سگریٹوں کا دھواں اور بیئر۔ ایک عورت اس کے نزدیک آ کر بیٹھی اور کہنے لگی:

''میرے ساتھ چلو۔ چلو نا۔ جیسے ہماری ساری زندگیاں پڑی ہوں۔ چلو۔ مجھے تم پسند ہو۔''

وہ مسکرانے لگی۔ ہارون نے سوچا وہ نسوانی حسن کا اچھا پیکر ہے۔ لیکن کیا

طوائف ہے؟ یا ایسی بیوی جسے چھوڑ دیا گیا ہو؟ اس نے ہارون کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ملائم سا ہاتھ۔ طوائف؟ یا بس دکھوں کی ماری عورت؟ اس کی آنکھوں سے اداسی جھلک رہی تھی اور یہ بات ہارون کو اچھی لگی۔ اس کی آنکھیں نیلی اور بال سرخ تھے اور اس نے دیہاتی عورتوں کی طرز کا لباس پہن رکھا تھا۔ ہارون نے ایک اور بیئر پی۔ اس نے وہسکی سے دل بہلایا۔ ہارون کو کچھ یاد نہ تھا کہ انہوں نے یہاں کس قدر وقت گزارا ہے۔ کتنی دیر وہ ٹہلتے رہے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے جیسے برسوں کی آشنائی ہو۔ اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ کتنی منزلیں وہ طے کر چکے ہیں۔

''آؤ آؤ۔ میں تمہیں چاہتا ہوں۔ آ جاؤ دنیا بھر کا وقت پڑا ہے۔''

وہ طوائف تھی — یہ نرمی، یہ لطافت — نہیں نہیں وہ عورت تھی۔ دکھوں کی ماری۔

''پیار کرنا تو تمہیں خوب آتا ہے۔ لیکن کتنی بری بات ہے ہم کبھی ایک دوسرے کو دوبارہ نہ دیکھ سکیں گے! ہاں۔''

دونوں گہری نیند سو گئے۔ پھر وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے نیچے اترے۔ لگتا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے گہری محبت کرتے ہیں اور جدا ہونا نہیں چاہتے۔ لیکن انہوں نے کافی پی اور اپنی اپنی راہوں پر چل دیے۔

''کتنی بری بات ہے، ہم کبھی ایک دوسرے کو دوبارہ نہیں دیکھ سکیں گے۔''

ہارون نے کوئی سوال نہ کیا تھا۔

دوسرے روز کام کی جگہ چند فٹ کے فاصلے پر ایک فرانسیسی مزدور ہارون کے پاس آیا۔

''کہو کیا حال ہے؟''

''ٹھیک ہے۔''

''اور ویک اینڈ؟''

''بس خوش قسمتی ساتھ دے گئی۔''

وہ ہنسنے لگا۔

فرانسیسی مزدور نے جوش و ولولے سے ہوا میں بوسہ اچھال دیا۔

ہارون ہنسنے لگا تھا۔

''اور میں ۔ میں نے اپنے ہی وطن کی ایک عورت کو طوائف سمجھا۔''

مزدور نے ہارون کی طرف دیکھا اور پھر نگاہیں نیچی کر لیں۔

''آہ میرے بھائی ۔ یہ ذہن ہی ہے ۔سب کچھ ذہن میں ہی ہوتا ہے۔''

دونوں کام کی جگہ پہنچ گئے ۔ ہارون کے سر پر سرخ بالوں اور نیلی آنکھوں والی نوجوان عورت سوار تھی ۔کاش اس سے دوبارہ ملاقات ہوسکتی۔

کریم کو دیکھتے ہی اسے فائزہ کا خط، اپنا غصہ اور جواب یاد آ گیا۔ایک لمحے کے لیے بھی اسے اپنا ردعمل نامناسب نہ لگا تھا۔اسے یہی جواب دینا چاہیے تھا۔ وہ ہے ہی ایسی عورت ۔اس قسم کے جواب ہی سے اسے قرار آئے گا۔

کھانے کے وقفے میں کریم نے گزشتہ واقعہ کے متعلق بات کرنا چاہی تو ہارون نے اس کا منہ ویسے ہی بند کر دیا جیسے وہ جمال کا کر چکا تھا:

''اپنے کام سے کام رکھو۔''

ویسے کریم ناراض نہیں تھا۔ اسے ہارون کی سمجھ ہی نہ آتی تھی ۔ البتہ وہ اسے پسند ضرور کرتا تھا۔تم اس پر بھروسہ کر سکتے ہو۔اس کی بات کا اعتبار کر سکتے ہو۔ مدد کے لیے بھی وہ تیار رہتا ہے ۔ زندگی کو سمجھتا ہے لیکن اپنے تجربے کو دوسروں پر رعب ڈالنے کے لیے استعمال نہیں کرتا۔مگر اپنی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ ایسا کیوں۔

فائزہ اور اس خط کو ذہن سے جھٹک کر وہ دوبارہ اس نوجوان عورت کے بارے میں سوچنے لگا جو اسے اتفاق سے مل گئی تھی اور جس کا سراپا بے حد جاذب نظر تھا۔لگتا تھا کہ وہ صرف پیار کرنے کے لیے ہی بنا ہے۔لیکن کیا مسئلہ صرف جسم کا ہے؟ وہ ساری محبتیں؟ کہاں سے آئی تھی وہ؟ کون تھی؟ اس کی آپ بیتی کیا ہے؟ آخر اس نے اسے ہی کیوں منتخب کیا؟ اس حالت کو وہ کیونکر پہنچی؟ لیکن کیا مسئلہ صرف جسموں کا ہے؟

وہ محض اس کے جسم کو ہی یاد نہ رکھے گا۔ بلکہ محبت کو، اعتماد کو اور احترام کو بھی۔ ہاں احترام کو بھی۔اس کے کسی لفظ، کسی اشارے، کسی نظر نے بھی اسے ٹھیس نہ پہنچائی تھی۔

ہارون کا خط گھر پہنچ گیا۔حسب معمول والدین نے جمال کو پڑھنے کے لیے کہا۔ خط عربی زبان میں لکھا ہوا تھا اور جمال نے پہلے اسے خود چپکے سے پڑھ لیا۔

''سناؤ نا بیٹا۔''

''پڑھا نہیں جاتا۔''

''تمہیں ہماری زبان ذرا بہتر طور پر پڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ آخر اتنے عرصے تک سکول جانے کا فائدہ ہی کیا ہے؟''

''کسی کی تحریر پڑھنا ہمیشہ آسان نہیں ہوتا۔''

خود خط پڑھ کر جمال ساری بات سمجھ گیا تھا۔ اس کے نتائج کو جان کر اس نے بات بدلنے کا فیصلہ کر لیا۔

''اس نے لکھا ہے کہ وہ ٹھیک ٹھاک ہے اور تم لوگوں کے متعلق سوچتا رہتا ہے۔ وہ بہت محنت کر رہا ہے۔ نوکری قائم رکھنے کے لیے فرانس میں اب بڑی محنت سے کام کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔ وہ یہ لکھتا ہے کہ پیرس میں سردی بہت ہے اور یہ کہ بچے کی پیدائش کے موقع پر وہ یہاں آنے کی پوری کوشش کرے گا لیکن اپنے حالات کی وجہ سے وہ پکا وعدہ نہیں کر سکتا۔''

عائشہ یہ باتیں سن کر بہت خوش ہوئی۔ ثمینہ جلدی سے فائزہ کو بھی بلا لائی۔ جمال نے ایک نظر اس کو دیکھا اور پھر خط کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''کہتا ہے کہ جلد ہی ایک اور خط لکھے گا۔''

''بڑا اچھا بیٹا ہے۔ بڑا بہادر ہے۔ اپنے ماں باپ کی، خاندان کی عزت کرتا ہے تعریف ہو خدا کی۔''

''خدا کرے وہ جلد آئے اور پھر ہمیں چھوڑ کر نہ جائے۔''

احمد نے یہ جملہ ادا کرتے ہوئے جمال کی طرف رخ کیا۔

''اچھا تم زیادہ روانی سے ہماری زبان پڑھنے پر توجہ دو۔''

جمال ہنسنے لگا اور فائزہ جلدی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ثمینہ کمرے میں داخل ہوئی تو فائزہ کپڑوں کی الماری میں چیزیں رکھ رہی تھی۔ اب اس نے چیزیں نکال کر کمرے میں ادھر ادھر پھینک دیں۔

جمال نے اپنے مخصوص انداز میں دروازے پر دستک دی۔

''آ جاؤ۔''

وہ اندر داخل ہوا اور کمرے میں بکھری ہوئی چیزوں کو دیکھ کر فائزہ کی طرف

MashalBooks.com

دیکھنے لگا۔

''کچھ کہنے کو آئے ہو۔ اچھا کہو۔''

ہچکچاہٹ پر قابو پاتے ہوئے جمال نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''بات یہ ہے کہ میں نے وہ باتیں پڑھ کر نہیں سنائیں جو خط میں لکھی ہیں۔''

''ہوں۔ تو خط میں کیا لکھا ہے؟''

اس کا چہرہ درشت اور آواز تیز تھی۔ جمال چونکا اور پریشان بھی ہوا۔

''کچھ بولو گے یا نہیں؟''

''ہارون کو تمہارا خط مل گیا ہے۔ بہت ناراض ہے اس پر اس نے والدین سے شکایت کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تمہیں اس کو احکامات دینے کا کوئی حق نہیں اور یہ کہ تم والدین کو بتائے بغیر اسے خط نہیں لکھ سکتیں۔ اگر میں یہ باتیں پڑھ کر سنا دیتا تو تم جانتی ہی ہو جھگڑا کھڑا ہوتا۔''

''لیکن جمال تم انہیں یہ خط سنا ہی دو۔ بہتر یہی ہے۔ انہیں سب کچھ بتا دو۔ لاؤ مجھے دو۔ میں خود انہیں سناؤں گی اور ہر بات صاف ہو جائے گی۔''

''خط اب میرے پاس نہیں۔ تمہیں پتہ ہی ہے ماں خط کو سینے سے لگاتی ہے اور پھر جیب میں رکھ لیتی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ یوں کسی نہ کسی روز انہیں پتہ چل ہی جائے گا کہ خط میں کیا لکھا تھا۔ میں تو تنگ آ چکی ہوں جمال۔ یہ زندگی نا قابل برداشت بوجھ بن گئی ہے۔ ہارون کو خط میں نے اس لیے لکھا تھا کہ ہمارے والدین کی خواہش کے مطابق ہم دونوں میاں بیوی ہیں۔ اس لیے بھی کہ ہمارے ہاں بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ لیکن وہ اپنے ماں باپ سے ذرا بھی مختلف نہیں۔ ہارون کے لیے، ان کے لیے میں صرف ان کی خواہشات کی کنیز بن کر رہ سکتی ہوں۔ نہ کہ جیسی میں ہوں یا جیسی میں بننا چاہتی ہوں۔ میں اب یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ میری حد سے باہر ہے۔ میں پاگل ہو جاؤں گی۔ ویسے ہی جیسی پاگل عورتیں میں نے ہسپتال میں دیکھی تھیں۔''

فائزہ کے لب و لہجے میں اس قدر شدت اور اس کے جذبے میں اس قدر برہمی تھی کہ جمال کو یقین ہو گیا کہ اب وہ پیچھے قدم نہ ہٹائے گی۔ اس جوش و ولولے سے، اس

بغاوت سے وہ بیک وقت پریشان ہوا اور خوش بھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا بڑا بھائی فائزہ کے آگے نہ جھکے گا اور اگر وہ یہاں گھر ہی میں رہتا تو بھی اس کے اور اس کی بیوی کے اختلافات کم نہ ہوتے۔ بلکہ حالات یقیناً زیادہ خراب ہوگئے ہوتے۔ وہ جانتا تھا کہ مردوں کے لیے اپنی سوچ کو اپنے طرزِ عمل کو بدلنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ ہر شے، تعلیم، عادات، معاشرہ اور بے جا غرور اس راہ میں حائل ہوتی ہے۔ فاطمہ اور اس کی چند دوستوں سے آشنائی کے بعد وہ بہتر طور پر جان چکا تھا کہ ان کی خواہشیں رسوم و رواج کو کس حد تک چیلنج کر رہی ہیں۔ رواج کے دامن میں پناہ لینا آسان ہے۔ اس طرح خوف اور عدم تحفظ کے احساس سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔ ہارون اور فائزہ کو ایک دوسرے سے بات کرنے، ایک دوسرے کو سمجھنے اور اپنی صورت حال کا فہم حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ درکار تھا۔ فاطمہ سے وہ آزادی سے بات کر لیتا تھا لیکن محض آزادی سے بات کر لینے سے تو مشکلات حل نہیں ہو جاتیں۔ اس حد سے آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ اپنی قوتوں اور اپنی حدوں کا شعور حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اور اگر ہمیں دوسروں پر اختیارات حاصل ہوں تو پھر اپنے مفادات کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ کس قدر مشکل کام ہے یہ۔ جمال کی شدید حساسیت، اس کے بے شمار تضادات، یہ خاندانی جھگڑے اور بھابھی کی شخصیت میں اس کی کشش جس کا رخ اب اس کی دوست فاطمہ کی طرف ہو گیا تھا۔ ان سب باتوں نے مل کر حال ہی میں اسے بہت آگے قدم اٹھانے میں مدد دی تھی لیکن اس کے قدموں تلے زمین اب بھی نازک تھی۔ تجربے سے محرومی اور جوش کی زیادتی کی بنا پر وہ اب بھی حقائق کو بدلنے کی خواہش میں ان سے ٹکرا جاتا تھا۔

''مجھے اکیلا چھوڑ دو جمال۔''

فائزہ تقریباً چیخنے لگی تھی۔

پہلے تو جمال ہچکچایا لیکن پھر کسی سکنڈل کے خوف سے وہ باہر نکل گیا۔ اس کے ذہن میں ایک خیال آ گیا تھا۔ کسی نہ کسی طرح وہ ماں کی جیب سے خط حاصل کر کے اسے جلا دے گا تاکہ بات آگے نہ بڑھے اور وقت بھی مل جائے۔

کمرے میں اکیلی فائزہ نے اپنا غصہ فرش پر بکھری چیزوں پر دوبارہ نکالنا شروع کر دیا۔ کسی دستک کے بغیر عائشہ اندر آ ئی۔ غالباً اس نے فائزہ کی آواز سن لی تھی۔ فرش پر بکھری

ہوئی چیزوں کو اس نے دیکھا اور بہو کے چہرے کے تاثر سے وہ سہم گئی۔ فائزہ کچھ کہے بغیر اس کے آگے سے گزر کر باہر نکل گئی۔ یہ ماجرا دیکھ کر عائشہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور وہ گدے پر گر گئی۔ ٹانگیں اب اسے سہارا نہ دے رہی تھی۔ ''آہ۔ اف۔ او۔ف۔ کیسی بھول ہوئی ہم سے۔'' ماں کو تلاش کرتے ہوئے بچے کمرے میں آ گئے۔

''ماما، نفیسہ نے میرا ٹیلی فون چرا لیا۔''

''نفیسہ بھائی کو فوراً ٹیلی فون واپس دے دو۔''

نفیسہ چیختی ہوئی بھاگ گئی۔ ظاہر ہے وہ ٹیلی فون واپس نہیں کرنا چاہتی تھی جو دراصل اسی کو دیا گیا تھا۔ اور اس وقت وہ اسے خود سے الگ کرنے پر تیار نہ تھی۔

''خدا کی قسم تم بڑی شیطان ہو۔ اس گھر میں آخر ہو کیا رہا ہے؟ یہ دن دیکھنے سے تو بہتر تھا کہ مر ہی جاتی۔''

عائشہ بمشکل اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی تھکن سے وہ نڈھال ہو چکی تھی۔

رات بھر وہ کروٹیں بدلتی رہی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ سارے مسائل کا حل یہ ہے کہ وہ پیر صاحب کے مزار پر جا کر دعا کرے۔ پھر وہ اپنے خیالات کو، تخیل کو اور اپنی پوری قوت کو مرتکز کر کے اس مقدس سفر کے متعلق سوچنے لگی جس نے اچانک اس کے تمام مسائل حل کرنے اور گھر سکھ چین واپس دلانے کی آس دلائی تھی۔

دو روز بعد عائشہ صبح سویرے صحن پار کر رہی تھی۔ وہ بے حد باوقار دکھائی دے رہی تھی اور اس نے بالکل نیا برقع پہن رکھا تھا جو احمد ایک رات پہلے لایا تھا۔

''میں شام سے پہلے آ جاؤں گی۔''

''امن سے جاؤ بی بی۔ امن سے۔'' احمد نے اسے جواب دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عائشہ کہاں جا رہی ہے۔ اس نے بچوں کو سنبھال رکھا تھا جو حسب معمول ماں کے پیچھے بھاگنا چاہ رہے تھے۔ نہایت توجہ سے اس نے بچوں کو رنگ برنگے کاغذ دیے اور اڑنے والے پنکھ بنانے کا طریقہ بھی سکھایا۔ بچے اب باپ کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ فائزہ صحن میں صفائی کرنے کی تیاری کر رہی تھی اور ثمینہ نے بیٹھک کی جھاڑ پونچھ کا کام شروع کر دیا تھا۔

سفر کے دوران عائشہ نے مقدس مقام کی طرف جانے والے راستے کے شاندار نظاروں کی طرف کم ہی توجہ دی۔ وہ اپنے مقصد میں پوری طرح کھوئی ہوئی تھی۔

MashalBooks.com

جہاں تک ممکن تھا اس نے بس پر سفر کیا اور پھر گاؤں کے وسط میں بس سے اتر گئی۔ ایک منٹ کے لیے وہ خاموش کھڑی رہی۔ دائیں ہاتھ میں بھری ہوئی ٹوکری پکڑے اس نے پہاڑی کی چوٹی پر واقع درگاہ کی طرف دیکھا جو خاردار جھاڑیوں، سو سال سے بھی زیادہ پرانے زیتون کے درختوں، صنوبر اور ایلوا کے درختوں سے گھری ہوئی تھی۔ اس نے چلنا شروع کیا۔ مگر راستہ آسان نہ تھا کیونکہ پاؤں تلے پتھر پھسل جاتے تھے اور ہر قدم پر خشک زمین سے خاک اڑتی تھی۔ راستے کی مشکلات کو خوشی سے جھیلتے عائشہ مزار کی طرف جا رہی تھی۔ برقع کا آنچل ہوا میں لہرا رہا تھا اور وہ منہ ہی منہ میں آیتیں پڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی نظریں چوٹی پر چھوٹی سی سفید مسجد پر لگی تھیں۔ گرمی زوروں پر تھی۔ وہ منہ صاف کرنے کے لیے تھوڑی دیر رکی اور آیتوں کا ورد دوبارہ شروع کر دیا۔ ایک چھوٹی سی لڑکی ہاتھوں میں بڑا سا کالا پتھر اٹھائے مزار کی طرف سے واپس آ رہی تھی۔ عائشہ نے اسے دیکھا لیکن وہ عائشہ کی طرف توجہ کیے بغیر گزر گئی۔ سانس لینے کے لیے وہ دوبارہ رکی، منہ صاف کیا اور پھر چلنے لگی۔

چھوٹی سی مسجد کے دروازے پر پہنچ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکی اور پھر اندر چلی گئی۔ اندر کا حصہ تاریک اور سرد تھا۔ عورتیں دعائیں مانگ رہی تھیں۔ ان میں سے اکثر عمر رسیدہ تھیں۔ عائشہ نے جھنڈوں اور کتبوں سے ڈھکی ہوئی دیوار کو بوسہ دیا اور مزار کے گرد چکر لگانے لگی۔ جلتی بجھتی موم بتیوں کی روشنی کتبوں پر پڑ رہی تھی جنہیں یہ عورتیں پڑھ نہ سکتی تھیں۔ عائشہ نے اپنی چٹائی بچھائی، ٹوکری اپنے پاس رکھی اور موم بتیوں پر صندل کا دھواں دینے لگی۔ پھر اس نے اپنی نذر پیش کی اور سہارہ نشینوں کی ایک بوڑھی عورت کی طرف بڑھی جو ساتھ والے کمرے میں بیٹھی تھی۔ عائشہ اس کے سامنے جھکی تو اس نے دعائیں دیں۔ چٹائی پر واپس آ کر عائشہ نے چاروں کونوں میں پیسے پھینکے اور پھر بیٹھ کر خشوع و خضوع سے دعائیں مانگنے لگی، چاروں طرف بیٹھی عورتیں بھی اپنی مرادیں پوری ہونے کی آس لے کر آئی تھیں۔

''یا سیدی، میں بڑے مرادیں لے کر تیرے در پر حاضر ہوئی ہوں تو میری التجا سن لے اور میرے بیٹے ہارون کو میرے پاس واپس بھیج دے۔ بس وہ پھر میرے ساتھ ہی رہے۔ اسے یہاں روزگار مل جائے۔ وہ ہمارے ساتھ رہے، اپنی بیوی کے ساتھ اور

اپنے ہونے والے بچے کے ساتھ۔

''یا سیدی میری بہو کو تنگ کرنے والی بلائیں دور کردے۔ وہ اب میرے بچوں کو بھی تنگ کرنے لگی ہیں۔ یا سیدی میں تیرے در کی سوالی ہوں۔ تجھ سے مانگتی ہوں اور تجھ ہی سے مرادیں پاؤں گی۔ میری مدد کر میں تیرے پاؤں پڑتی ہوں میری مرادیں پوری کردے۔ یا سیدی اپنی اس ناچیز کنیز کو دکھ درد دور کردے۔ گھر کے معاملات بگڑتے ہی جا رہے ہیں یا سیدی، بگڑتے ہی جا رہے ہیں۔''

فریاد کے انداز میں عائشہ نے ہاتھ اوپر اٹھائے اور پھر نیچے کر کے اپنے سینے پر رکھ لیے۔

''یا سیدی میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کیا کروں۔ بس تو ہی میری فریاد سن لے۔ سن رہا ہے نا یا سیدی؟ میرا بڑا بیٹا ہارون فرانس واپس چلا گیا ہے اور اس عورت کو ہمارے پاس چھوڑ گیا ہے۔ تب سے گھر کے حالات بگڑتے جا رہے ہیں۔ بیٹا باپ کی نہیں سنتا اور باپ بیٹے کو پیٹتا ہے۔ مجھ سے اب یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوتا۔ میری مدد کر۔ میں تیرے دربار پر چڑھاوا دوں گی۔ ایک بکرا ذبح کروں گی۔ سیدی، یا سیدی میں تیرے در کی سوالی ہوں۔ میری فریاد سن۔ سن لے میری فریاد۔''

چاروں طرف عورتیں سا ای جوش و ولولے سے دعائیں مانگ رہی تھیں۔ بعض آ جا رہی تھیں۔ عائشہ نے چٹائی پر تھوڑی دیر مراقبے میں گزاری پھر آہستہ سے اٹھی، برقع اوڑھا، ٹوکری اٹھائی اور واپسی کی راہ لی۔ مزار کے باہر جھک کر اس نے تھوڑی سی خاک اٹھائی۔ ایک چٹکی ماتھے پر لگائی۔ باقی کو احتیاط سے رومال میں باندھ لیا اور رومال کو ویسی ہی احتیاط کے ساتھ ٹوکری میں ڈال لیا۔ لگتا تھا کہ اس کے دل کا بوجھ اب ہلکا ہو گیا ہے۔ مسائل کے حل ہونے کی امید بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ دھوپ اور گرم زمین میں جھینگر گا رہے تھے۔ وہی چھوٹی سی لڑکی صنوبر کے درخت کے سائے تلے سڑک کے کنارے بیٹھی تھی۔ کالے پتھر کو اس نے پیٹ سے لگا رکھا تھا۔ اس نے عائشہ کو جاتے ہوئے دیکھا تو عائشہ مسکرا دی۔ وہ یوں احتیاط سے چل رہی تھی کہ جیسے گرنے کا خدشہ ہو۔ اب وہ شام سے پہلے گھر پہنچنے کی کوشش میں بس اور سفر کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

MashalBooks.com

فائزہ کو جمال سے معلوم ہوا کہ عائشہ رد بلا کے لیے منت ماننے گئی ہے تو سسرال والوں سے اس کے فاصلے اور بھی بڑھ گئے اور وہ تھکاوٹ کا بہانہ کر کے کمرے میں پڑی رہی۔ وہ عائشہ کی واپسی پر موجود رہنا نہیں چاہتی تھی لیکن لیٹنے کے باوجود اسے نیند نہ آئی۔ چنانچہ وہ اٹھ کر کمرے میں ادھر ادھر چکر لگانے لگی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور دونوں ہاتھ پیٹ پر، بچے پر تھے۔ اسے یقین ہونے لگا کہ اس گھر میں اس کی مکمل شکست کے بغیر ہر اس شے کو قبول کیے بغیر جسے یہاں درست، ضروری اور ناقابل تغیر سمجھا جاتا ہے، بات نہ بنے گی۔ لیکن اب وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ بات اس کے بس کا روگ نہیں۔ پھر وہ کیا کرے؟ چلی جائے؟ لیکن کہاں؟ اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ لہٰذا اس نے کندھوں پر چادر ڈالی اور صحن میں آ گئی۔ روشنیاں گل تھیں اور گھر پر سکون تھا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ انجیر کے درخت کا سہارا لے کر وہ کھڑی ہوگئی اور پھر دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ پھر اس نے اپنا منہ اینٹوں کے ساتھ لگا دیا اور اس کے ہاتھ دیوار پر لگے تھے جیسے وہ اسے دھکا دینا چاہتی ہو۔ کئی بار اس نے دیوار سے سر ٹکرایا۔ پھر ساکت ہوگئی۔ تخیل، بھولی بسری یادوں اور غیر منظّم خیالوں کے ہجوم میں اس کا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ لگتا تھا جیسے اس کے دل و دماغ میں کوئی شدید طوفان اٹھ رہا ہو جسے سکون کی خاطر ساحل کی جستجو ہو۔ پیٹ میں بچہ ہلنے لگا تو فائزہ تاروں بھری گہری رات میں ایک بار پھر چلنے لگی۔ تھک ہار کر وہ اندر آ گئی اور جلد ہی نیند نے اس پر غلبہ پا لیا۔

دوسری صبح وہ اٹھی تو اسے یوں لگا جیسے اس نے خواب میں اسی جہاندیدہ اور پیاری کزن کو دیکھا ہو جس نے شادی کے روز اس کی اداسی کو بھانپ لیا تھا۔ فائزہ کو محسوس ہوا جیسے خواب میں بھی اس نے وہی الفاظ دہرائے ہوں ''میری جان زندگی پر تو مسکرانا ہی

MashalBooks.com

پڑتا ہے۔ مسکراؤ گی نہیں تو زندگی دھوپ میں رکھی ہوئی بکری کی پرانی کھال کی طرح چڑ مڑ ہو جائے گی۔''

زندگی پر مسکرانا ہی پڑتا ہے۔

وہ مسکرانا چاہتی تھی لیکن جب عزیز ترین خواہشوں کی بھی نفی ہو جائے اور محض خاموشی اور اطاعت کا مطالبہ کیا جائے تو کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کیسے آ سکتی ہے۔

تمہیں زندگی پر مسکرانا ہوگا۔ تمہیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔

عائشہ اور ثمینہ درخت کے نیچے بیٹھ کر ناشتہ کر رہی تھیں۔

''ہم ابو سے ٹیلی ویژن کے لیے مستری کو بھیجنے کا کہنا بھول ہی گئے۔ خیر اس کے بغیر بھی گزارہ ہو ہی سکتا ہے۔ بچے اس سے کوئی اچھی بات تو سیکھتے نہیں۔ ارے یہ فائزہ ناشتے کے لیے کیوں نہیں آئی؟ جاؤ دیکھو۔''

ثمینہ جانے کے لیے اٹھی لیکن اسی لمحے فائزہ اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ اس نے ایسے کپڑے پہن رکھے تھے جیسے وہ سیر کے لیے جا رہی ہو۔ البتہ اس نے برقع نہیں اوڑھ رکھا تھا۔ ثمینہ کو دیکھ کر وہ محبت سے مسکرائی اور اسے پیار کیا۔ عائشہ نے اسے دیکھا تو بات کو سمجھ نہ سکی۔ لیکن پریشان ضرور ہو گئی۔

''کہاں جا رہی ہو؟ کیا کر رہی ہو؟''

''میں جا رہی ہوں۔''

عائشہ اچھل پڑی۔ برتن ٹوٹ گئے اور اس نے زور سے ثمینہ کو پرے دھکیل دیا جو بت بنی کھڑی تھی۔ حیران و پریشان اور آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ وہ دروازے کے سامنے کھڑی ہو گئی اور فائزہ کو بازو سے پکڑ کر اس کی راہ روکنے لگی۔

''فائزہ، اگر تم اس طرح گھر سے باہر قدم نکالو گی تو پھر کبھی قدم اندر نہ رکھ سکو گی۔ فوراً اپنے کمرے میں واپس چلی جاؤ۔''

فائزہ نے غیر متوقع قوت کے ساتھ اپنے آپ کو چھڑایا اور باہر کا دروازہ کھول دیا۔ عائشہ اب اسے دامن سے کھینچ رہی تھی۔ لیکن وہ باہر نکل گئی۔

''نہ جاؤ فائزہ، بدقسمت عورت بن جاؤ گی۔''

سراسیمگی اور بے بسی کے عالم میں مبہوت سی ثمینہ یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔

MashalBooks.com

''ہارون میرے بیٹے تم کیوں واپس چلے گئے تھے۔ ہائے کیا قیامت ہے کیا قیامت۔''

فائزہ کے پیچھے بھاگنے کا ارادہ ترک کر کے عائشہ نے باہر کا دروازہ بند کیا۔ رنج اور غصے سے اس کے حواس جواب دے رہے تھے اور جنون کے عالم میں وہ خود کو پیٹنے لگی تھی۔ چیخ و پکار سن کر بچے بھاگتے ہوئے آئے اور پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے ماں کو دیکھنے لگے۔ ثمینہ اسی جگہ پر کھڑی رونے لگی تھی۔

بازار اور اس کے معاملات سے بے نیاز فائزہ حوصلے کے ساتھ قدم اٹھا رہی تھی۔ وہ ایک نئی قوت محسوس کر رہی تھی جیسے اس نے نیا جنم لیا ہو۔

وہ رضیہ کے گھر کے آگے سے گزری۔ رضیہ نے اسے پردے کے بغیر دیکھا تو اس کی چال ڈھال اور چہرے کے تاثرات سے معاملے کو بھانپ گئی۔ ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا کہ وہ آگے بڑھ کر فائزہ کو روک لے لیکن فائزہ پہلے ہی موڑ مڑ چکی تھی اور وجدانی طور پر رضیہ بھی سمجھ گئی تھی کہ کوئی ایسا مستقل واقعہ پیش آ گیا ہے جس کو وہ بدل نہیں سکتی۔ لیکن وہ خوف زدہ تھی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ فائزہ نے خود کو داؤ پر لگا دیا ہے اور یہ کہ کسی سہارے کے بغیر، دولت کے بغیر اور کوئی روزگار ملنے کے امکان کے بغیر جو عورت اس طرح اپنا گھر چھوڑتی ہے اسے اگر سسرال والے دوبارہ قبول نہ کریں یا والدین پناہ نہ دیں تو وہ اپنا سب کچھ گنوا لیتی ہے۔

پیٹ کے بوجھ اور اکھڑتی سانسوں کے باوجود فائزہ تیزی سے اپنے والدین کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔

تیز چلنے کی تھکاوٹ اور شکستہ جذبوں کے دکھ کے ساتھ جب فائزہ شہر کے دوسرے حصے میں اپنے والدین کے گھر پہنچی تو حمیرہ سلائی کا کام کر رہی تھی۔ جب اس نے دروازہ کھول کر اپنی بیٹی کو بے پردہ دیکھا اور اس کے چہرے کے تاثرات پر نگاہ ڈالی تو سکتے میں آ گئی۔

''فائزہ میری بیٹی، میری جان، تجھے کیا ہوا؟''

فائزہ چکرا کر فرش پر گر پڑی۔

''خدایا، میرے خدایا، یہ کیا قیامت آ گئی۔''

فائزہ بمشکل اٹھی، گہرا سانس لیا اور منہ پر ہاتھ پھیر کر دروازے کے دستے کا

سہارا لیتے ہوئے کہنے لگی:

''میں کبھی وہاں واپس نہ جاؤں گی۔''

یہ جملہ اس نے اس قدر شدت سے ادا کیا کہ حمیرہ مبہوت رہ گئی۔

''فائزہ تم نے ہمیں ذلیل کیا ہے۔''

پھر وہ رونے لگی۔ فائزہ نے جانے کے لیے پوری قوت اکٹھی کی۔

''ہاں چلو۔ یہاں سے بھی جاؤ۔''

لیکن اب قدم اٹھانے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ نڈھال ہوکر دوبارہ گرگئی۔

''میں یہ سب کچھ نہیں چاہتی تھی۔ میں اپنے شوہر کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن میں پرانے دنوں کی طرح نہیں رہ سکتی ہوں۔ اپنے بچے کو اپنی مرضی سے پالنا چاہتی ہوں۔ زندگی۔نہیں۔'' وہ بے ہوش ہوگئی۔

MashalBooks.com

فائزہ کو ہسپتال پہنچا دیا گیا جہاں اس نے وقت سے پہلے ہی ایک بچی کو جنم دیا۔ تاہم بچی ٹھیک ٹھاک تھی۔ جب فائزہ کو بچی پیدا ہونے کا علم ہوا تو وہ خوش ہوئی کیونکہ اس کے سسرال والے اور اس کا شوہر بھی لڑکے کی تمنا رکھتا تھا۔ اب وہ زیادہ چیخ و پکار کے بغیر بچی کو اس کے حوالے کر دیں گے۔

چند روز بعد جب اسے اپنے کیے کا احساس ہوا تو اکثر اوقات اس پر انتہائی گھبراہٹ طاری ہو جاتی۔ مستقبل کے بارے میں اندیشوں سے نجات پانے کے لیے وہ تخیل کی دنیا میں دیکھتی کہ شوہر اس کے پاس لوٹ آیا ہے اور یہ کہ وہ اس کے ساتھ مختلف انداز میں زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ عائشہ کو یقین تھا کہ فائزہ کے سر پر جن ہے اور وہ اس قدر طاقتور ہے کہ اس کی دعاؤں اور منتوں کا بھی اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ اس لیے جب اس کا غصہ اترا تو اس نے سوچا کہ یہ سب کچھ ٹھیک ہی ہوا ہے اور یہ کہ خدا کی مرضی یہی تھی۔

احمد چند روز غصے میں رہا۔ بار بار وہ سوچتا کہ فائزہ کو لینے جائے اور اسے اپنا ارادہ بدلنے، شکست تسلیم کرنے اور گھر میں اپنے فرائض ادا کرنے پر مجبور کرے۔ لیکن ہارون نے، جسے فوری طور پر سارے معاملے سے آگاہ کر دیا گیا تھا، باپ کی دکان پر ٹیلی فون کیا اور کہنے لگا ''اسے جانے دو' ہاں اسے جانے دو۔ اور احمد خدا کے آگے جھک گیا کہ جو وہ چاہتا ہے وہی ہو۔

اسے جانے دو۔ ہارون فائزہ کو زبردستی نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اول تو وہ شادی ہی کے خلاف تھا۔ لیکن شادی ہو گئی اور اب وہ ماں بننے والی تھی۔ اسے جانے دو۔ اسے ایک اور علیحدگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ویسے اسے دکھ ہوا۔ ان دنوں وہ اپنے بیٹے کے متعلق سوچا کرتا تھا۔ اسے جانے دو۔ اب وہ پھر تنہا رہ گیا تھا۔ وطن میں اس کی کوئی بیوی نہ رہی تھی۔

لیکن تنہا وہ کب نہیں تھا؟

MashalBooks.com

فائزہ تنہا نہ تھی۔ پہلو میں اس کی بچی تھی۔نوراں کی یاد میں وہ اس کا نام بھی نوراں رکھنا چاہتی تھی جو زندگی کا گہرا فہم رکھتی تھی۔ پھر یہ بھی ہے کہ نور کا مطلب روشنی ہے۔

انگلیوں سے اس نے بچی کے رخسار پر پیار کیا ''میری جان، میری بچی، میری حور، میری روشنی، نہ رو کہ بہت سی خوشیاں تیری منتظر ہیں۔تم گھوموگی، بھاگوگی، باتیں کرو گی اور سمندر میں نہایا کرو گی۔ گیت گایا کرو گی۔ دن میں صنوبر کے درخت اور رات کو ستارے دیکھا کرو گی اور سنگترے کے درختوں سے پھل اتار کر کھایا کرو گی۔ناشپاتیاں اور تربوز بھی کھاؤ گی جو تمہاری زبان کی طرح گلابی ہوتے ہیں۔نہ رو میری جان۔''

نرس دروازے سے جھانکی اور اس کی باتیں سن کر مسکرادی۔

''تمہیں کوئی ملنے آیا ہے۔''

اس نے پورا دروازہ کھولا تو آنکھوں میں، مسکراہٹوں میں اور دلوں میں پرخلوص دوستی لیے پھولوں اور بچے کے لیے تحفوں سے لدی پھندی فاطمہ، لیلیٰ، مریم اور زہرہ اندر داخل ہوئیں۔ ان کی موجودگی سے فائزہ جان گئی کہ آنے والے دنوں کی مشکلات کم ہوں گی۔

☆☆☆

MashalBooks.com